بسلسلۂ ڈائمنڈ جوبلی پاکستان

پاکستان میں اُردو ناول

(1947 تا حال)
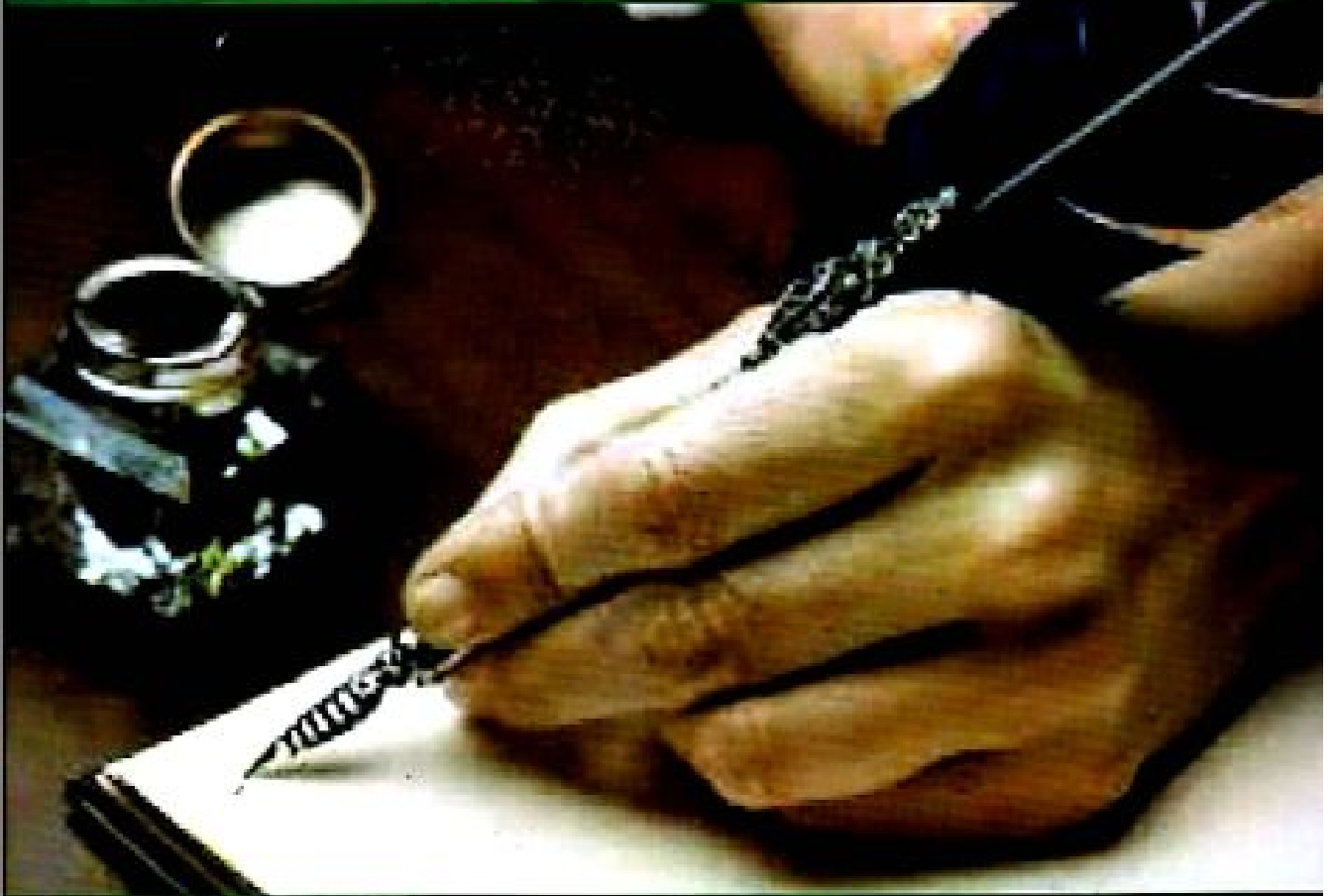
انتخاب و تجزیہ: رفاقت حیات

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی اُردو ناول

(1947تا2021)

(ایک انتخاب)

انتخاب و ترتیب: رفاقت حیات

فہرست

پاکستانی اردو ناول-(1947تا2021)
(ایک انتخاب)
75 برس کا گوشوارہ

رفاقت حیات

اردو زبان میں ناول تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد برسوں سے لکھا جا رہا ہے۔ دو تین سال پہلے یاروں نے اس کی ایک سو پچاسویں سال گرہ منائی اور اس موقعے پر بعض جریدوں نے ناول نمبر بھی نکالے، جن میں اس تمام عرصے میں لکھے جانے والے اردو ناولوں کا جائزہ لیا گیا۔ ان میں نئے پرانے سبھی ناولوں پر مضامین لکھے گئے اور یہ سلسلہ ابھی تک تھم نہیں ہے۔ ہر طرح کے ناقد ناول پر لکھتے اور بات کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے ہاں ناول کی جتنی ریل پیل آج دکھائی دے رہی ہے، اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ اسی لیے ناولوں کی معیار بندی ضروری بلکہ ناگزیر ہو جاتی ہے اور اس کے بارے میں غور و خوض کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر افسوس کی بات ہے کہ یہ غور و خوض فی زمانہ ناولوں پر لکھے جانے والے بیشتر مضامین اور تبصروں میں دکھائی نہیں دیتا۔ شاید پاکستانی اردو ناول ابھی اپنے بہترین ناقد کے انتظار میں ہے جو نہ صرف دیانت داری اور غیر جانب داری سے اس کا جائزہ لے بلکہ اس کی فنی قدر کا تعین بھی کرے۔ اسے دیگر زبانوں کے فکشن کے ساتھ رکھ کر دیکھے اور بتائے کہ کیا اردو ناول نے آج تک واقعی کوئی سنگِ میل عبور کیا ہے یا نہیں؟ کیا اس نے دنیا بھر کے ادب میں کوئی اضافہ کیا ہے یا نہیں؟ یا کیا اردو ناول کا پورا سفر ایک لاحاصلی اور رائیگانی سے عبارت ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ہمارے ناولوں کا امتیاز کیا بنتا ہے؟ ہمارے کون سے ناول نگار بے عیب اور کامل ہیں؟ ہمارے ہاں بیانیے کی سطح پر کون کون سے تجربات ہوتے رہے؟ یہ اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے سوالات کا جواب ایک خلاق ذہن رکھنے والا ناقد ہی دے سکتا ہے، ناقص قسم کی تنقید و تحقیق نے فی زمانہ جس کا گلا گھونٹ رکھا ہے لیکن ہمیں مستقبل میں اس طرف پیش قدمی کی امید یقینی طور پر رکھنی چاہیے۔ ہمارے نئے ناقدین اردو ناول کی دریافت، اس کی عظمت و تنزلی اور رفعت و انحطاط کے بارے میں اپنی بے باکانہ آرا سے جلد ہی ہمیں چونکائیں گے۔

اردو ناول کی روایت کا مغربی ناول کی روایت سے موازنہ کرنا گمراہ کن ثابت ہو سکتا ہے کیوں کہ ان کے فکشن کی روایت تقریباً پانچ سو سال پرانی ہے اور ان کے فکشن کی روایت کو متاثر کرنے والی فلسفے، سائنس، مصوری، مجسمہ سازی، صنعت و حرفت اور دیگر علوم و فنون کی روایات بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ فلسفے اور سائنس کی دنیا میں پیدا ہونے والی تحریکوں نے جہاں ان کی زندگی کو متاثر کیا، وہیں پر ان کے فکشن پر بھی اپنا اثر انداز چھوڑا۔ ہمارے پاس شعر و موسیقی ہی ایسے قدیم فنون ہیں، جنھیں ہم دنیا کے بڑے ادب کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ مغرب کا فکشن خصوصاً روسی فکشن ڈکنز کے ترجموں کا مرہونِ منت تھا۔ بقول محمد سلیم الرحمن، "ٹالسٹائی اور دوستوئیفسکی دونوں کہتے تھے کہ اگر ڈکنز کو نہ پڑھتے تو کچھ بھی نہ کر سکتے۔ ہم نے ڈکنز کی طرف دیکھا تک نہیں۔ صرف رینالڈز کے ترجمے کرتے رہے، جسے انگریزی ادب میں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔" ہمارے ہاں ابتدا میں عربی فارسی کے نثری تراجم پر زیادہ زور رہا۔ پھر ترکی زبان سے بھی تراجم کیے گئے۔ ناول کی ابتدا ہونے کے بعد کی چند دہائیوں تک ہمارے معاشرے میں ناول پڑھنا ہی معیوب اور مخرب الاخلاق سمجھا جاتا رہا۔ مغرب میں فکشن لکھنا عرصہ دراز سے ایک کل وقتی مشغلہ ہے جب کہ ہمارے ہاں صورتِ حال اس سے یکسر مختلف اور برعکس ہے۔

پاکستانی اردو ناول کا یہ انتخاب آزادی کے بعد پاکستان میں لکھے گئے اور شائع ہو چکے ناولوں پر محیط ہے اور 75 برسوں میں لکھے جا چکے ناولوں کے ایک مختصر ترین جائزے پر مشتمل ہے۔ اس انتخاب میں پاپولر ناول، جاسوسی / مذہبی ناول اور دیگر ڈائجسٹوں یا اخبارات میں چھپنے والے مقبولِ عام ناول شامل کرنے سے گریز برتا گیا ہے۔ یہ انتخاب کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ پڑھنے والوں کو منتخب شدہ ٹکڑے میں ایک افسانے کی سی لذت میسر آئے، یعنی وہ ایک پوری بات کہتا ہو۔ یہ کوشش کتنی کامیاب رہی، یہ بات اس انتخاب کے قارئین ہی بتائیں گے۔ یہ انتخاب ادبی اور سنجیدہ نوعیت کے ان ناولوں سے کشید کیا گیا ہے جن کو تخلیق کرتے ہوئے زبان و بیان، ہیئت، تکنیک، فارم اور موضوع کی ندرت کو بھی خاص طور پر ملحوظِ خاطر رکھا گیا یا اس کی شعوری کوشش کی گئی۔ ان ناولوں کا مطالعہ اپنے قاری کو ہر تر قسم کی ایسی مسرت سے ہم کنار کرتا ہے جس میں بصیرت کے ساتھ اور ایک

خالص انسانی تجربے کی گہرائی شامل ہوتی ہے۔ ایک سنجیدہ ادبی ناول سے ہم پہنچنے والی مسرت کا کوئی نعم البدل نہیں۔ یہ اپنے پڑھنے والے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رہ جاتی ہے اور اس کے ذہن پر ایسے نقش چھوڑ جاتی ہے، جو ان مٹ ہوتے ہیں اور یہی بات ایک سنجیدہ ادبی ناول کو کمرشل ناول یا پاپ فکشن سے ممتاز درجے پر فائز کرتی ہے۔ سو اس انتخاب میں ایک طرف ایسے ناول شامل کیے گئے ہیں، جنھوں نے اپنی اشاعت کے بعد ادب کے سنجیدہ قارئین اور ناقدین کو متاثر کیا، جن پر ادبی حلقوں میں بحث و تمحیص کی گئی، تو دوسری طرف چند ایسے ناول بھی شامل کیے (جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں)، لیکن المیہ یہ ہوا کہ اشاعت کے بعد انھیں بوجوہ یکسر فراموش کر دیا گیا۔ لیکن طویل عرصے بعد جب وہ دوبارہ چھپ کر سامنے آئے تو پڑھنے والے چونک کر یہ پوچھنے پر مجبور ہوئے کہ یہ کب لکھے گئے تھے۔ مگر صاحبو، ناول کے ساتھ یہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور شاید آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

اردو ادب میں دو طرح ناول نگار زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے اپنی زندگی میں شروع تا آخر صرف و محض ناول کو اپنے اظہار کے لیے منتخب کیا اور اس کے سوا کچھ اور کبھی نہ لکھا، (ایسے لکھنے والے بلاشبہ ناول نگار کہلائے جانے کے مستحق ہیں) اور دوسرے وہ، جن کا زیادہ تخلیقی جھکاؤ کسی دوسری صنف (شاعری، افسانہ، تنقید) کی جانب رہا لیکن انھوں نے ذائقہ بدلنے کے لیے ایک آدھ ناول بھی لکھ دیا۔ (ستم کی بات یہ ہے کہ ایسے لکھنے والے بھی خود کو ناول نگار کہلائے جانے پر بضد رہتے ہیں)۔ کہا جاتا ہے کہ لاطینی امریکہ کے ناول میں بوم کا سبب صرف ایک ہی ناول بنا تھا اور وہ تھا خوان رلفو کا پیدرو پرامو۔ (کاش ان میں سے کوئی اس پائے کا ناول بھی ہوتا۔) تو دوستو، ان اکا دکا ناولوں میں سے ان کو فوقیت دی گئی جن پر سنجیدہ ادبی حلقوں میں کچھ بات چیت ہوئی یا ان کا نوٹس لیا گیا، یا پھر انھیں منتخب کیا گیا جن کے لکھنے والوں نے دو یا دو سے زائد ناول لکھے۔

اردو ناول کے مطالعے سے ایک اور بات کھلتی ہے کہ زیادہ زور دار اثر اور گہرائی کے حامل ہمارے زیادہ تر وہ ناول ہیں جنھیں ہم ناولٹ، ناولا، یا مختصر ناول وغیرہ کہتے ہیں۔ ان کے متعلق اب یہ تکلف برطرف کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔ کیوں کہ فکشن کے یہ طویل تر ٹکڑے اپنی وسعت، شدت اور ادبی اہمیت میں کئی طویل اور ضخیم ناولوں پر بھاری دکھائی دیتے ہیں۔ یہ

ٹکڑے اپنے اندر ایک پورا قصہ یا کہانی لیے ہوئے کہتے ہیں۔ ان میں ایک پورا عہد سانس لیتا دکھائی دے جاتا ہے۔ ایک فرد کی مکمل صورت حال — اس کی زندگی کا ایک بھرپور عکس۔ اب سے انھیں بھی ناول سمجھا جا رہا ہے۔ میرے ایک سینیئر دوست جو ایک بہترین ادبی مجلے کے مدیر ہیں، انھیں یقین واثق ہے کہ قرۃ العین حیدر کے مختصر ناول ان کے ناولوں کے مقابلے میں فنی طور پر کہیں زیادہ چابک دستی سے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ ناول ہمارے چند بہترین ناولوں میں سے ایک ہیں، اسی لیے اس انتخاب میں انھیں کسی تخصیص کے بغیر بطور ناول شامل کیا گیا ہے۔

برصغیر کی تقسیم سے پہلے اردو ناول اپنے خد وخال کسی حد تک واضح کر چکا تھا۔ رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر، پریم چند، عزیز احمد، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر، عصمت اور سجاد ظہیر اردو ناول کی روایت کو مستحکم کرنے میں اپنا حصہ ڈال چکے تھے۔ جس مقصدیت اور اصلاح معاشرہ کا وزن ڈپٹی نذیر احمد نے اردو ناول پر لادا تھا، اردو ناول اب اس سے اپنا دامن چھڑوا کر نئے جہانوں کی تلاش و دریافت میں مصروف دکھائی دینے لگا تھا۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جتنی اہمیت اور توجہ ڈپٹی نذیر کو ملی، ان کے بعد لکھنے والوں کو نہیں مل سکی۔ دھیرے دھیرے ہمارے ناول نگاروں کو کرداروں کے باطن میں اترنے، ان کی نفسیات کھنگالنے، ایک فرد کے وجودی، تہذیبی اور ذہنی رشتے ڈھونڈنے، فرد کی شکست و ریخت، فوری غم اور اس سب کچھ کو تخلیقی سطح پر برتنے کے سلیقے اور ہنر کی جانب بھی توجہ دی جانے لگی تھی لیکن اردو ناول کو ابھی بہت کچھ سیکھنا تھا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقسیم سے پہلے اور بعد کے طویل زمانے تک اردو ادب کے افق پر ناول کے بجائے اردو افسانے کا طوطی بولتا رہا یعنی لکھنے اور پڑھنے والوں دونوں کی ترجیحات میں ادبی ناول سے زیادہ افسانہ ہی تھا کیوں کہ اسے ایک نشست میں مکمل پڑھنا ممکن ہوتا ہے۔ تقسیم سے بہت پہلے اگرچہ رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد، اخبار اودھ میں قسط وار شائع ہوتا رہا، مگر اس وقت کے اردو کے دیگر اخبارات و جرائد نے اس روش کو اپنانے سے اجتناب برتا اور ناول پر افسانے شائع کرنے کو فوقیت دی۔ تقسیم سے کچھ عرصہ قبل اردو دنیا میں ماہنامہ "ساقی" کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس پرچے میں اردو افسانے تواتر سے شائع ہوتے

رہے مگر اردو کے ان ناولوں کے اشتہار بھی چھپتے تھے جنہیں ساقی بک ڈپو شائع کرتا تھا۔ اردو دنیا کے سبھی نثر نگار ساقی میں چھپنا اپنے لیے باعث اعزاز سمجھتے تھے۔ تقسیم سے پہلے اردو افسانے نے ایک قسم بالادستی ہوئی تھی جو بعد میں بھی کافی عرصے تک قائم رہی۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت، غلام عباس اور دیگر چوٹی کے افسانہ نگاروں نے اپنے پڑھنے والوں پر گویا ایک سحر طاری کیا ہوا تھا۔ ایسے میں کیسا ناول اور کہاں کا ناول۔ محمد خالد اختر نے منٹو پر اپنے خاکے میں ہمیں بتایا کہ منٹو ناول کو فضول سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں افسانہ جو بات چھ سات صفحات میں کہتا ہے، ناول نگار وہی بات کہنے کے لیے بے شمار صفحات برباد کرتا ہے۔ اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ناول جیسی صنف کے بارے میں ایسے خیالات رکھتا تھا۔ محمد خالد اختر جیسا اردو کا بڑا ناول نگار، منٹو سے اپنی ملاقاتوں کے دوران اس بات سے ڈرتا اور بعد میں اس کی خواہش کرتا رہا کہ کاش، منٹو اس پر کوئی افسانہ لکھ کر اسے اپنے ایک لافانی کردار میں تبدیل کر دیتا۔ ناول کے حوالے سے صرف منٹو ہی کیا، اردو کے تقریباً سبھی بڑے ناقدین کی تحریروں کو دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ عسکری صاحب کی سب سے عمدہ تحریریں یا تو اردو افسانے کے بارے میں ملتی ہیں یا فرانسیسی شاعروں اور ناول نگاروں کے بارے میں۔ اردو ناول پر انہوں نے جو تھوڑا بہت لکھا، وہ کسی طور قابل ذکر نہیں۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب، اردو افسانے کی حمایت میں لکھی اپنی کتاب میں ایک دو مقامات پر یہ جتانے کی کوشش کرتے دکھائی دیے کہ مغرب میں اولیت ناول کی صنف کو حاصل ہے، افسانے کو نہیں، مگر انہوں نے خود دو ناول اور کچھ ناولوں جیسے طویل تاریخی افسانے لکھے، بعض ناولوں پر ان کے دیباچے بھی شائع ہوئے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ انہوں نے اردو ناول کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ وارث علوی کی بہترین تنقید بھی اردو افسانے کے گرد ہی گھومتی ہے۔ شمیم حنفی صاحب نے کہانی کے پانچ رنگوں میں تین ناول نگاروں پریم چند، یلدرم اور قرۃ العین حیدر کا ذکر کیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو تنقید نے تقسیم سے پہلے اردو ناول کو کسی طرح اہم نہیں سمجھا اور اگر تقسیم کے بعد کچھ نقاد اس طرف متوجہ بھی ہوئے تب بھی انہوں نے اپنی توجہ ناول سے زیادہ شاعری، افسانے اور دیگر مباحث پر مرکوز رکھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ اردو ناول نے خود ابھی زندگی کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنا

شروع ہی کیا تھا۔ وہ افسانے کا مقابلہ تو کر سکتا تھا اور اس نے کیا بھی لیکن شاعری کا مقابلہ کرنا اس کے بس میں نہ پہلے تھا اور نہ آج ہے۔ ہماری شعری روایت ہمارے فکشن کی روایت سے کہیں زیادہ وسیع اور کئی لحاظ سے عظیم بھی ہے۔ ہمارے فکشن کو اردو شاعری کی ہم سری کرنے میں شاید زمانہ لگ جائے گا (مگر وہ زمانہ اب زیادہ دور بھی نہیں ہے)۔

قیام پاکستان کے بعد بتدریج پاکستانی ناول نے اپنے خد و خال وضع کرنے شروع کیے۔ عبداللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں" کو پہلا پاکستانی ناول قرار دیا جاتا ہے، کیوں کہ یہ پنجاب کی زندگی کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ فنی اسقام کے باوجود یہ آج تک اردو کے سب سے زیادہ مقبول ناولوں میں سے ہے۔ یہ اعزاز محمد خالد اختر کے "چاکیواڑہ میں وصال" یا شوکت صدیقی کے "خدا کی بستی" کو اس لیے نہیں دیا گیا کیوں کہ وہ تاریخی اور تہذیبی مسائل کو اپنا موضوع بنانے سے گریز کرتے ہیں اور الگ الگ انداز سے پاکستان کے پہلے دور حکومت میں بسنے والے عام لوگوں کی زندگی کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ بہر حال تقسیم کے فوراً بعد لکھے جانے والے زیادہ تر ناول برصغیر کی سیاست اور تاریخ کو اپنا موضوع بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ تقسیم کا تجربہ اردو فکشن پر حاوی رہا۔ ظاہر ہے کہ بے شمار انسان ہجرت کے اذیت ناک عمل سے گزر کر ایک نئے ملک کے شہری بنے تھے۔ وہ اپنے پرکھوں اور اجداد کی سرزمین سے اپنا ناطہ توڑ کر ایک بالکل نئی سرزمین پر آئے تھے۔ اسی لیے وہاں سے منسلک ان کی یادوں اور ذاتی تجربات و احساسات کا اظہار اردو ناول میں بڑے شد و مد کے ساتھ ہوا۔ تاریخ اور سیاست ہمارے ناول کے دو خاص اور مرغوب موضوعات ہیں، جن پر تقسیم سے لے کر آج تک سب سے زیادہ لکھا گیا ہے اور ان موضوعات کو کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ دونوں چیزیں روز اول سے یہاں بسنے والے انسانوں کی زندگی کو متاثر کرتی آئی ہیں اور یہ عمل ختم ہونے والا بھی نہیں۔ تاریخ کے دھاروں پر بنتی مٹتی تہذیب و معاشرت ہمارے ناول کا ایک اہم موضوع رہی ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں نمایاں ہونے والے اردو ناول میں جہاں ایک طرف مڑ مڑ کر ماضی کی جانب دیکھنے اور اسے کریدنے کا عمل دکھائی دیتا ہے تو دوسری جانب اس مملکت خدا داد کے مختلف علاقوں میں بسنے والی مخلوق کی ابتری و کسمپرسی اور اس کی ابتلا کو بھی اپنا موضوع بنایا گیا۔

پاکستانی اردو ناول ابتدا سے ہی اپنے مواد، موضوع اور مسائل کے لحاظ کافی زرخیز رہا ہے۔ تقسیم کے فوراً بعد ناول میں جہاں ایک طرف فسادات اور اس کے بعد بننے والے نئے ملک کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا گیا تو دوسری جانب ہجرت کی وجہ سے اپنی جڑوں سے کٹ کر الگ ہو جانے کا المیہ اردو ناول پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔ عزیز احمد کا ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" 1948 میں شائع ہوا اور اسے عسکری صاحب نے اجتماعی ناول قرار دیا۔ اس ناول میں حیدرآباد دکن کی اشرافیہ کی زندگی کے ٹھاٹھ باٹھ دکھائے گئے ہیں۔ بقول عسکری صاحب، " اجتماعی ناول کے ایک معنی یہ ہیں کہ ناول نگار کو شعوری طور پر معاشرے کی تصویر کشی منظور ہے۔ اسے افراد سے بحیثیت افراد کے دل چسپی نہ ہو بلکہ فرد سے اس حد تک غرض ہو جہاں تک کہ وہ معاشرے کے کسی رجحان کی عکاسی کرے۔ "میری دانست میں اس زمانے کے بیشتر لکھنے والوں کا مطمع نظر یہی تھا کہ افراد کے بجائے معاشرے کی اجتماعی تصویر پیش کی جائے۔ محمد احسن فاروقی اپنے ناول "شام اودھ"، عبداللہ حسین "اداس نسلیں"، شوکت صدیقی "خدا کی بستی" میں یہی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ سینیئر ناول اکرام بریلوی کا طریقہ کار اس سے ذرا مختلف تھا۔ وہ پورے معاشرے کو موضوع بنانے کے بجائے فرد پر توجہ دیتے ہیں۔ ان کا ناول "لاوا" مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ فرد کی کہانی کہتے ہوئے سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کی جانب انگشت نمائی کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ اکرام بریلوی کے دیگر ادبی کام کی طرح ان کے ناولوں کو اب تک پوری طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کو چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اسے آدم جی ادبی انعام کا مستحق سمجھا گیا۔ یہ بلاشک و شبہ نہایت عمدگی سے کرافٹ کیا گیا ناول ہے۔ اس میں تقسیم کے المیے کے اثرات کو اجتماعی نکتہ نظر کے بجائے چند کرداروں کے انفرادی نکتہ ہائے نظر سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے جس زمانے میں "آنگن" شائع ہوا، لگ بھگ اسی برس، خان فضل الرحمن کا مشہور ناول "آنت کا ٹکڑا" بھی شائع ہوا، جسے عوامی پذیرائی تو ملی لیکن کسی ادبی انعام کا مستحق نہ سمجھا گیا۔ خان صاحب اپنے بے باک طرز تحریر کے لیے مشہور تھے۔ وہ کسی صلے کی پروا کیے بغیر ناول نگاری کرتے رہے۔

معلوم نہیں یہ اردو ناول کی بڑھتی ہوئی مقبولیت تھی یا ساقی بک ڈپو کی فرمائش، جس نے اپنے دور کے مشہور ترین طنز و مزاح نگار شوکت تھانوی کو ناول کی جانب متوجہ کیا اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اردو کو کئی ناول دیے۔ مجھے سمجھ نہیں آسکی کہ یار لوگ آج تک محمد خالد اختر کو مزاح نگار کس لیے قرار دیتے آئے ہیں۔ وہ اپنے پورے فکشن میں بے حد سنجیدہ قسم کے مصنف محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے ہوں یا ناول ان کے ہاں ایک ایسی متین شگفتگی ملتی ہے جو مزاح کی ایک بالکل الگ قسم ہے۔ شوکت تھانوی کو ہم روایتی مزاح نگار کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ان کا تعلق عظیم بیگ چغتائی کی قبیل کے مزاح سے تھا۔ اس کے برعکس خالد اختر کی متین شگفتگی بیچ بیچ میں کئی مقامات پر سنجیدگی اختیار کرتی محسوس ہوتی ہے۔ ناول "چاکی واڑہ میں وصال" اختتام تک پہنچتے پہنچتے اداسی کی حدیں چھونے لگتا ہے۔ ایسی لطیف اور اداس کردینے والی تحریر اردو میں ان کے سوا کسی اور سے نہیں آج تک نہ آسکی۔

تقسیم سے پہلے ادبی دنیا میں بحیثیت افسانہ نگار اپنی شناخت قائم کرنے والے ابوالفضل صدیقی نے بھی کراچی میں اپنے قیام کے دوران اردو ناول کا دامن اپنے کچھ ناولوں سے بھرنے کی سعی کی۔ ان کا ناول "ترنگ" فکشن کے دل دادگان کے لیے توشۂ خاص سے کم نہیں جو ان کی وفات کے بعد کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اس کا موضوع کھیتوں میں پوست کے پیدا ہونے، اس کی افزائش اور اس سے منشیات بنانے کے عمل سے لے کر اس کی ترسیل تک کے معاملات کو نہایت خوبی کے ساتھ، ایک جیتے جاگتے گاؤں کی کہانی کی شکل میں دلچسپ کرداروں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ گاؤں کی معاشرت، سیاست اور جاگیرداری سماج کی جکڑ بندیوں کو سید شبیر حسین نے اپنے ناول "جھوک سیال" میں خوب صورتی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اس ناول نے شائع ہوتے ہی شہرتِ عام حاصل کی لیکن پھر یہ وقت کی دھول میں کہیں چھپ گیا مگر شنید ہے کہ یہ ناول گزشتہ دنوں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ 2021 میں شائع ہونے والے نجم عباسی نے اپنے پہلے ناول "رقص نامہ" میں سندھ کے دیہی سماج میں پیری مریدی اور اس کے مضمرات کو عمدگی سے فکشن میں ڈھالا ہے۔

انتظار حسین ایسے خوش قسمت ادیبوں میں تھے جن کے افسانوں کے ساتھ ان کے ناولوں کا بھی چرچا ہوتا رہا۔ جس میں ان کے ہاں بھی سماجی، سیاسی اور تہذیبی حقیقت نگاری ملتی ہے۔ ان

کے ہاں زبان کو برتنے کا سلیقہ نہایت عمدہ ہے۔ ان کے کردار کئی زمانوں میں سفر کرتے ہیں، دیومالا، قصے کہانیوں اور داستانوں سے سفر کرتے ہوئے ہمارے زمانے تک آتے ہیں اور اسے ایک نئی معنویت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہجرت محض ایک مقام سے دوسرے تک جانے کا نام نہیں بلکہ ایک مقدس چیز تھی۔ ان کے ناول ہوں یا افسانے ان میں پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھنے کا عمل تواتر کے ساتھ دکھائی دیتا ہے لیکن اس عمل کے ذریعے وہ زمانہ حال کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سرسری طور پر دیکھتے اور پرکھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔
ان کا بیانیہ اور ماحول بیشتر مقامات پر بے حد اکہرا اور سادہ معلوم ہوتا ہے۔ انتظار حسین جدیدیت کی تحریک کے دوران نمایاں تو ضرور ہوئے لیکن انہوں نے اس کے اثرات سے خود کو پوری طرح بچائے رکھا۔ انتظار حسین کے ایک اہم ترین ہم عصر حسن منظر نے بھی اپنی پہچان افسانے لکھ کر بنائی لیکن اس کے بہت بعد آگے چل کر انہوں نے ناول لکھنے پر بھی بھرپور توجہ دی۔ "العاصفہ" ان کا پہلا ناول تھا اور "دھنی بخش کے بیٹے" دوسرا ناول۔ اپنی اشاعت کے بعد ان دونوں ناولوں نے اپنے پڑھنے والوں کو متاثر کیا۔ اس کے بعد ان کے تقریباً چار مزید ناول شائع ہو چکے ہیں۔ بطور ناول نگار ان کا کام لائق توجہ اور بے حد وقعت کا حامل ہے۔ محمد سلیم الرحمن نے اپنی ایک تحریر میں انہیں انتظار حسین کے مساوی فکشن نگار قرار دیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہیں انتظار حسین کے مقابلے میں کم شہرت مل سکی۔
اے حمید اردو کے بہترین رومان نگار اور سب سے زیادہ نثر لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ ان کا زیادہ تر ذکر ان کی امرتسر اور لاہور کی یادوں کے حوالے سے ہوتا ہے کیوں کہ انہوں نے ادبی ناول کم اور کمرشل ناول زیادہ لکھے۔ ان کے ساتھ ستھرے اور نکھرے اسلوب کی جھلک ان کے ناول "پھر بہار آئی" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے اس ناول اور کچھ افسانوں کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔ قدرت اللہ شہاب نے افسانوں کے علاوہ ایک ناولٹ بھی لکھا تھا، جس کا نام "یاخدا" ہے، جو تقسیم کے المیے کو ایک بدحال عورت کے نکتہ نظر سے دیکھنے کی معصومانہ کوشش سے زیادہ کچھ نہیں۔ قدرت اللہ شہاب اور ان کے دوستوں کا گروہ اسی زمانے میں شہاب ثاقب کی طرح نمایاں ہوا تھا، جس کی روشنی ایک خاص قسم کے رجعت پسندانہ نکتہ نظر سے لکھی جانے والے فکشن کو جا لگی رہی۔

1961 میں شائع ہونے والی ایک کتاب ""علی پور کا ایلی"" نے ناول اور پھر ایک سوانحی ناول کے طور پر بہت شہرت حاصل کی۔ کئی نامور ادیبوں نے اس پر تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسائے۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد منٹو کی ناول کی تعریف لامحالہ درست معلوم ہونے لگتی ہے کیوں کہ یہ ناول نہیں بلکہ واقعات کا جنک یارڈ ہے۔ ناول بطور صنف ایک ایسا کل یا مکمل وجود رکھتا ہے جس کا ہر حصہ ایک ناگزیر اہمیت رکھنے کے ساتھ ناول کے بنیادی قصے کو آگے بھی بڑھاتا ہے مگر علی پور کا ایلی میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ حیرت ہے ایک عمدہ افسانہ نگار نے ناول لکھتے ہوئے یہ بات کیسے نظرانداز کر دی۔ بہر حال اسے گزرے دنوں کی ایک یادگار آپ بیتی سمجھ لیجیے۔ اس کے علاوہ ان کے دوست ""احمد بشیر"" کا ناول ""دل بھٹکے گا"" جو ایک سوانحی ناول ہے۔ ""علی پور کا ایلی"" کی نسبت یہاں ہمیں سلیقے اور ترتیب سے لکھا ہوا ایک عمدہ طویل بیانیہ ملتا ہے، جس کو لکھنے والا ذہنی بنیاد پر انسان کو تقسیم کرنے کا دعوی نہیں ہے۔ یہی رویہ ایک حقیقی فکشن نگار کا طرہ امتیاز ہونا چاہیے۔ سوانحی ناول یا آپ بیتی لکھنے کے لیے گزری ہوئی زندگی کے کاٹھ کباڑ میں سے چند ضروری واقعات لے کر ان کو سلیقے اور ترتیب سے بیان کرنے کا نام ہے۔ اسی باعث ""گورکی کی آپ بیتی"" آج بھی دنیا بھر میں تحسین کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ آپ بیتی ادب کی ایک مستقل صنف رہی ہے جس میں شاعر ادیب یا کوئی اور شخص اپنی زندگی کے حالات و واقعات صداقت سے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ناول زیادہ تر تخیل و تصور کی تخلیق ہوتا ہے۔ اس میں جہاں حالات و واقعات گزرے ہوئے اور مفروضہ ہوتے ہیں وہیں انھیں بیان کرنے میں کچھ قوت صرف کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر لارنس کے مشہور ناول ""سنز اینڈ لورز"" کو اس کا سوانحی ناول کہا جاتا ہے لیکن اس میں لارنس نے اپنی پوری عمر بیان کرنے کے بجائے صرف اپنے لڑکپن اور جوان ہونے تک کے عرصے کو ہی اپنا موضوع بنایا تھا۔ اردو میں ایک آپ بیتی خاصی مشہور ہے اور بہت ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے، وہ دیوان سنگھ مفتون کی خود نوشت۔ وہ اتنی دل چسپ کتاب ہے کہ بعض پڑھنے والے اسے آپ بیتی کے بجائے ایک ناول سمجھتے ہیں۔

1961 میں ہی لاہور سے ایک اور ناول چھپا تھا جس کا دیباچہ فیض احمد فیض نے لکھا تھا اور وہ حمید شیخ کا ""گینڈا پہلوان"" تھا۔ اسے ادبی حلقوں میں کچھ پذیرائی حاصل ہوئی لیکن اس کے بعد

اسے یکسر فراموش کر دیا گیا۔ کئی دہائیوں بعد اسے اجمل کمال نے دوبارہ دریافت کر کے اپنے پرچے آج میں دوبارہ شائع کیا تو نئے پڑھنے والے حیران رہ گئے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ اردو کے ایک اور صاحب طرز ناول نگار خالدہ طور کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ انہیں بھی دوبارہ دریافت کرنے کا سہرا اجمل کمال کو ہی جاتا ہے۔ اب یہ دونوں ناول نگار اردو کے مین اسٹریم کے ناول نگار سمجھے جاتے ہیں۔ بظاہر اس سے مختلف لیکن کچھ ایسا ہی حال ہمارے ایک بہت سینیئر لکھنے والے اکرام اللہ صاحب کا بھی ہے، جن کے ناول "گرگ شب" کی وجہ سے انہیں کچھ زحمت بھی اٹھانی پڑی۔ انہیں نمایاں ہو کر منظر پر رہنے سے زیادہ گوشہ نشینی عزیز ہے۔ وہ کئی دہائیوں تک چپ چاپ سرگرم عمل رہے اور انہوں نے کئی بہترین مختصر ناولوں سے اردو کا دامن بھر دیا لیکن اردو ادب کی وہ اشرافیہ جو شیلی چھتری تلے جمع تھی اس نے کبھی بھولے سے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ اکرام اللہ کی تحریریں ان سب پر بھاری ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد کی دو تین دہائیوں میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور کے علاوہ جن خواتین ناول نگاروں نے ادب کی دنیا میں اپنا مستحکم کیا ان میں الطاف فاطمہ، حجاب امتیاز علی، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی، اور نثار عزیز بٹ بہت زیادہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب کی سب ایک دوسرے سے یکسر الگ لکھنے والیاں تھیں اور انہوں نے ناول کو مستقل طور پر اپناتے ہوئے تواتر کے ساتھ ناول لکھے۔ حجاب امتیاز کے علاوہ مگر سبھی ایک طرح کی حقیقت نگار تھیں، جنہوں نے اپنے ناولوں کی بنیاد اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات کو بنایا اور ان سے متاثر ہو کر فکشن لکھا۔ حجاب امتیاز کچھ فرضی کردار بنا کر انہیں ایک فرضی ماحول میں رکھ کر ڈرامائی انداز میں اپنی بات کہنے کی عادی تھیں، ان کا یہ انداز قبول عام حاصل نہ کر سکا۔

فضل احمد کریم فضلی نے قحط بنگال کے زمانے کے ایک گاؤں کے پس منظر میں اپنا پہلا ناول "خون جگر ہونے تک" لکھا۔ یہ ناول قحط کے دوران عام کسانوں پر گزرنے والی بپتا اور حکومتی بے حسی کی جانب اپنی توجہ دلاتا ہے۔۔ آگے چل کر سقوط ڈھاکہ جیسا دل خراش واقعہ بھی پیش آیا تو وہ ایک اہم ادبی موضوع بنا۔ اس پر بھی کچھ ناول لکھے گئے۔ صدیق سالک کا ناول "پریشر ککر"، محمد حمید شاہد کا "مٹی آدم کھاتی ہے" اور سلمی اعوان کا "تنہا" اس حوالے سے

سامنے آنے والے اہم ناولوں میں ہیں۔ محمد حمید شاہد کے ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" کو اسلوب اور ہیئت کے لحاظ سے ان سب ناولوں پر فوقیت حاصل حاصل ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے بھی اپنے ناول "صدیوں کی زنجیر" میں اسی موضوع کو برتا ہے بلکہ اردو کے بڑے ناول نگار عبداللہ حسین کا ناول "نادار لوگ" کا تانا بانا بھی سقوطِ ڈھاکہ کے گرد بنا گیا ہے۔ رحیم گل نے اپنے ناول "جنت کی تلاش" میں اردو فکشن کو سابقہ شمال مغربی صوبے کی بود و باش اور وہاں کی زندگی کے مسائل سے روشناس کروانے کی کوشش کی۔ اب اس صوبے کو خیبر پختون خواہ کہا جاتا ہے۔

اسی بیچ ناول کے افق پر ایک نئے ناول نگار فاروق خالد اپنے پہلے ناول "سیاہ آئینے" کے ساتھ منظر پر آئے۔ بعض سنجیدہ ذہنوں نے اسے سراہا اور اس پر تبصرے بھی لکھے۔ مگر یہ پذیرائی ان کی دیگر کتابوں کے حصے میں نہیں آئی۔ فاروق خالد کے ناول کا ماحول اور ان کے کردار گہرے اسرار لیے ہوئے ہوتے ہیں، جن کی تلاش و جستجو انہیں نت نئی جگہوں پر مارا مارا لیے پھرتی ہے۔۔ ان کے ناولوں "سیاہ آئینے" اور "کہانی دعاؤں کے اسیر" کو ابھی دریافت کیا جانا باقی ہے۔ یہ اردو ناولوں کے وہ دور افتادہ جزیرے ہیں جہاں کم ہی لوگوں نے پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

پاکستانی اردو ناول نے ابتدائی دو تین دہائیوں میں اپنی حیثیت کو خاصا مستحکم کر لیا اور اس کا دامن متنوع قسم کے ناول نگاروں سے بھرا رہا لیکن یہ وہی زمانہ تھا جب ترقی پسندی کی تحریک کی یک رخی حقیقت پسندی کے مقابل جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس نئی تحریک نے سب سے پہلے اردو تنقید، شاعری اور افسانے کو متاثر کرنا شروع کیا اور ناول میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ یہ تحریک بنیادی طور اسلوب اور ہیئت کی تبدیلی اور توڑ پھوڑ سے عبارت تھی۔ نئے ناول نگاروں نے اظہار کے پرانے وسیلوں کو ترک کرنے کے نئے ذرائع کی تلاش میں ناول کی فارم اور اسالیب کی توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ اسی عرصے میں ڈاکٹر انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ" منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں انہوں نے مذہبی بربریت، سیاسی جبر و تشدد اور تیسری دنیا کے ملکوں کی کمزور جمہوریتوں اور آمریتوں کے غیض و غضب اور استحصال کو اپنا بنیادی موضوع بنایا۔ انہوں نے ڈچ مصور بوش کی مشہور زمانہ

تصویر "ارضی خوشیوں کا باغ" سے متاثر ہو کر اپنے ناول میں اپنے زمانے کے عذابوں اور ثوابوں کو موضوع بنایا اور ناول کی ہیئت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ افسانے کی طرح ناول میں بھی انور سجاد نے جو فضا بند کی اس کا اثر فوری طور پر ہوا۔ انیس ناگی، نعیم اعظمی، اسلم سراج الدین، صغیر ملال اور مظہر الاسلام ایسے فکشن لکھنے والے جو جدیدیت کے علاوہ سارتر کے وجودی فلسفے سے شدید متاثر ہوئے۔ نعیم اعظمی اور صغیر ملال نے نثر میں شاعری کرنے اور نثری نظم کے قریب تر پہنچنے کی شعوری کوشش کی۔ مظہر الاسلام نے بھی اپنے ناول "محبت۔ مردہ پھولوں کی سمفنی" میں شعری حدود میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ ان تمام لکھنے والوں کے فکشن کو تجرباتی کہا جا سکتا ہے مگر یہ تجربہ آگے چل ایک بند گلی میں پہنچ کر دم توڑ گیا۔ اسی دور میں امراؤ طارق کا ناول "معتوب" کراچی سے شائع ہوا اور اس نے ادبی حلقوں کو اپنی جانب کسی حد تک متوجہ بھی کیا لیکن بعد میں اسے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا۔ یہ ناول کراچی پر ایک عرصے تک مسلط رہنے والے دہشت گردی کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض نے بھی اپنے ناول "کراچی" میں اسی دہشت گردی کو نشان زد کیا ہے اور اس کے عوامل اور وجوہات کو عام آدمی کے نکتہ نظر سے سمجھنے اور سمجھانے کی ایک کوشش کی ہے۔ اسی طرح محمد امین الدین کے ناول "کراچی والے" بھی اس موضوع پر ایک اہم ناول ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول "بہاؤ" میں ماضی کی ایک قدیم تہذیب کو اپنا موضوع بنایا اور اسے ایک کہانی کے ذریعے زندہ جاوید کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد سے ان کے لکھے ہوئے ناول ایک تواتر کے ساتھ اردو کے سنجیدہ ادبی حلقوں کو چونکاتے آئے ہیں۔ ارشد وحید کے ناول "ٹھکان" میں پاکستانی معاشرے میں سیاسی اور سماجی گھٹن کو ایک عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح مصطفیٰ کریم کا ناول "راستہ بند ہے" میں برصغیر کے مسلم معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹنے والی قدامت پسندی اور مذہبی بنیاد پرستی کو بڑے شد و مد کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔ نئے راستے ڈھونڈنے کے لیے جدت پسند سوچ کی ضرورت ہے جو کٹر مذہبی معاشرے اپنے افراد میں پیدا کرنے کی اہلیت کھو چکے ہیں۔ بانو قدسیہ نے اپنے شہرہ آفاق ناول "راجہ گدھ" میں حلال و حرام اور گناہ و ثواب کے مذہبی تصور کو نیم فلسفیانہ انداز

میں پیش کیا ہے۔ان کے اس ناول نے ہمارے دور کی بیشتر پاپولر فکشن لکھنے والیوں کے لیے بائبل کا درجہ حاصل کر لیا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ادبی دنیا میں یہ ناول اپنی اہمیت کھوتا جارہا ہے۔ وحید احمد نے اپنے ناول "زینو" میں ایک فرضی کردار کے فلسفے اور سائنس کو فکشن کا موضوع بنانے کی سعی کی۔

اشرف شاد کا پہلا ناول "بے وطن" جیسے ہی شائع ہوا اسے وزیر اعظم ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ناول بیرون ملک پاکستانیوں کے مسائل اور پریشانیوں کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ سعید نقوی کا پہلا ناول "گرداب" بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہے، وہ امریکہ میں بسنے والے ایشیائیوں کی زندگی کو ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز میں کہانی اور کرداروں کے تال میل سے اپنے ناول کی بنت کرتے ہیں۔

پاکستانی اردو ناول میں روزِ اول سے نت نئے تجربات ہوتے رہے لیکن نئی صدی کو نئے تجربات کی صدی کہا جا سکتا ہے۔اردو ناول کے سفر کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بات جو فوراً کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے بیشتر ناول نگار زبان و بیان کے علاوہ ہیئت اور فارم کے حوالے سے بھی خاصی عدم توجہ برتتے رہے ہیں۔ ناول بنیادی طور پر بیانیے کا فن ہے، بیانیہ جتنا پیچیدہ اور گنجلک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی کہانی سے بھی انصاف کرے گا، ناول اتنا ہی خوب ہوگا۔ اس کے علاوہ اسے کسی نہ کسی ہیئت یا فارم کی ضرورت بھی پڑتی ہے جس کی حدود اس کی بنیادی کہانی کے تار و پود میں پوری طرح پیوست ہوں، یعنی وہ فارم یا ہیئت اس کہانی کے لیے نہ صرف ناگزیر ہو بلکہ اس کا بوجھ غیر محسوس طریقے سے اٹھا کر چلے۔

2000 میں مکتبہ کلاسیک نے لاہور سے شیخ صلاح الدین عادل کا ناول "خوشبو کی ہجرت" شائع کیا۔اس ناول نے غیر محسوس طریقے سے اردو فکشن میں اس زمانے میں جادوئی حقیقت نگاری برتنے کی کوشش کی، جب لوگوں نے مارکیز کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ یہ ناول شیخ صاحب کی وفات کے بعد ان کے چند احباب نے مل کر شائع کروایا۔اس ناول سے ہمارے نئے پرانے سبھی لکھنے والے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ یہ ناول اپنے اسلوب، موضوع، کرداروں، ان کے ماحول اور ان کی کہانیوں کے تانے بانے کی وجہ سے توجہ کا مستحق ہے لیکن نہ معلوم

کیوں اس کا ذکر بھی سننے کو نہیں ملتا۔ ذکر تو سید مظفر اقبال کا بھی سننے کو نہیں ملتا، جن کے کچھ ناول پڑھنے والوں میں مقبول رہے۔

2001 میں محمد عاصم بٹ کا ناول "دائرہ" شائع ہوا، جس میں وہ شعوری طور پر اپنے اظہار کے لیے ایک ہیئت ڈھونڈتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسے خط مستقیم میں کہانی کہنے کا یارا نہیں، اس لیے دائرے میں سفر کرنا اسے مرغوب تھا۔ اس کے سات سال بعد مرزا اطہر بیگ کا ناول "غلام باغ" شائع ہوا جس نے زبان و بیان کے بنے بنائے سانچے توڑ کر رکھ دیے۔ اس نے ایک پیچیدہ اور مشکل بیانیہ تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ اسلوب کی حد تک "غلام باغ" ایک بہترین ناول ہے۔ تاہم اس کے معنیاتی نظام کی گہرائی تک پہنچنا ابھی باقی ہے۔

اختر رضا سلیمی کے دوسرے ناول "جندر" نے شائع ہوتے ہی سنجیدہ قارئین کی توجہ حاصل کی۔ یہ ناول اپنی ہیئت اور اپنے دل چسپ اسلوب کی بنا پر یقیناً ایک اچھا ناول ہے۔ اس ناول کہانی بھی ایک دائرہ مکمل کر کے اپنے نکتہ آغاز تک جا پہنچتی ہے۔ آزاد مہدی تواتر کے ساتھ اپنے ناولوں میں لاہور کی عام زندگی کی جھلکیاں محفوظ کرنے میں مصروف ہیں۔ انھوں میں اپنے ناول "ایک دن کی زندگی" میں ایک طوائف کی زندگی کے ایک دن کا کچا چٹھا بیان کیا ہے، جو اندرون شہر مقیم ہے۔ علی اکبر ناطق نے اپنے ناول "نولکھی کوٹھی" میں تقسیم کے حوالے ایک مختلف نکتہ نگاہ رکھنے کی سعی کی ہے۔ سید کاشف رضا نے اپنے پہلے "چار درویش اور کچھوا" میں ہیئت اور اسلوب کی سطح پر ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی اور بہت سی آوازوں سے بھرا ہوا ناول تخلیق کیا۔ یہ سب آوازیں احتجاجی اور باغیانہ قسم کی ہیں۔ انہوں نے اس ناول کے ذریعے اپنے ملک کی عصری تاریخ سے جوجھنے کی کوشش کی ہے۔ اصغر ندیم سید نے اپنے پہلے ناول "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" میں ملتان کی تاریخ اور تہذیب و معاشرت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ زیف سید نے "گل مینہ" میں دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ سے متاثر ہونے والے پاکستانی علاقوں کی حالت زار پر قلم اٹھایا۔

خواتین ناول نگاروں میں طاہرہ اقبال نے اپنے ناول "نیلی بار" میں پنجاب کی ہم عصر زندگی اور اس کے سیاسی، تہذیبی، سماجی اور معاشی شعور کے ارتقا کی کہانی سنائی ہے۔ نگہت حسن کا ناول "جاگنگ پارک" بڑے شہروں میں رہنے والی مشینی زندگی اور اس کے مسائل کو ہلکے پھلکے

انداز میں موضوع بنایا گیا ہے۔ آمنہ مفتی نے اپنے ناول "پانی مر رہا ہے" میں دریاؤں کے اجڑنے اور ایک دوسرے طریقے سے آباد ہونے ہونے کی کہانی لکھی ہے۔ مزید خواتین بھی ناول کی صنف کی جانب رجوع کر رہی ہیں۔

کوئٹہ سے تعلق رکھنے والے آغا گل نے اپنے ناول "دشتِ وفا" میں بلوچ نوجوانوں کے سیاسی اور جذباتی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے جب کہ محمد وسیم شاہد نے اپنے دوسرے ناول "دھاوری" میں بلوچستان کے دور افتادہ علاقے میں واقع اپنے گاؤں "دھاڈر" میں گزرے اپنے بچپن اور لڑکپن کی زندگی کی کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں کوئٹہ سے مزید عمدہ ناول آنے کی امید رکھنی چاہیے۔

تواتر اور سرعت کے ساتھ ناول لکھنے والوں میں خالد فتح محمد اور محمد حفیظ خان آگے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کی صنف کے ساتھ دونوں کی وابستگی سب پر ظاہر ہے۔

مارکیز نے اپنے کسی انٹرویو میں کہا تھا کہ ایک بڑھئی کی طرح ایک ناول نگار کو ناول کے فن کے بھی اسرار و رموز کم عمری میں ہی سیکھ یا جان لینے چاہئیں، تاکہ بعد میں وہ اس فن کو بہتر طریقے سے برتنے کا اہل ہو سکے۔ مارکیز ایک پیشہ ور ناول نگار تھا۔ اس نے ناول لکھنے کی خاطر بہت کچھ تج دیا تھا اور کل وقتی طور پر اس سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ناول کا فن جتنا مشکل اور ناممکن الحصول ہے، اچھے لکھنے والے سے اس کے مطالبے بھی اتنے ہی بڑے ہیں، اور اتنے بڑے کہ ہر ناول نگار انہیں پورا نہیں کر سکتا۔ ناول کے خیال کی پرورش اور پھر اس کے پہلے مسودے سے اس کی اشاعت کا مرحلہ آنے تک کئی بار اسے دوبارہ لکھا جاتا ہے، کاٹا چھانٹا جاتا ہے۔

اردو میں ناول لکھنے والوں کی صورتِ حال اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے۔ کل وقتی ناول نگاری کا جوکھم اٹھانے کا یارا ہمارے کم ہی لکھنے والوں کو نصیب ہو سکا اور جنھیں ہوا وہ بے چارے پبلشروں، مدیروں اور اپنے قارئین کے مطالبوں سے مرعوب ہو گئے اور جو نہیں ہوئے، انہوں نے اسے اتنا سہل جان لیا کہ اس کی پہلی نشست پوری ہونے کے بعد خود بھی اسے پڑھنے کا تردد نہیں کیا اور اسے چھپوانے کے لیے دوڑ پڑے۔ چند گنے چنے لکھنے والے ہی ایسے گزرے اور شاید اب بھی موجود ہیں، جو اپنے لکھے کے ساتھ خاصا وقت گزارنے کو پہلی ترجیح سمجھتے ہیں۔ پھر یہ بات ان کے لکھے ہوئے بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ کسی ناول کے پہلے چند صفحے اس کی

تقدیر کا فیصلہ صادر کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ یہاں مارکیز کی ایک بات یاد آرہی ہے۔ اس کے لیے ناول کا پہلا جملہ لکھنا بہت اہم کام ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ کئی دنوں کا جوکھم اٹھانے کے بعد اپنے لکھے ہوئے پہلے جملے سے مطمئن ہو پاتا تھا۔

پاکستانی اردو ناول کا یہ سفر جاری و ساری ہے اور اپنے لیے خوب سے خوب کی تلاش میں ہے۔ جو لعل و گوہر ہمارے ہاتھ آئے ہیں ان میں سے بعض بلاشبہ اس قابل ہیں کہ ہم انھیں فخر کے ساتھ اہلِ دنیا کے سامنے رکھ سکیں۔ ہمیں یہ امید رکھنا چاہیے کہ اردو کے ناول دھیرے دھیرے دقیقہ نظری کو اپنا شعار بنائیں گے اور زیادہ اچھے ناول سامنے لائیں گے۔

کچھ گزارشات و اظہارِ تشکر

اس انتخاب کا خیال عزیزی محمد عاصم بٹ سے فون پر گفتگو کے دوران پروان چڑھا، جس کے بعد میں نے اس کی تجویز لکھ کر اکادمی ادبیات، پاکستان کو بذریعہ ای میل ارسال کی۔ چند ہی روز اکادمی کے چیئرمین، جناب یوسف خشک صاحب کی طرف سے تحریری اجازت نامہ موصول ہو گیا، جس کے بعد اس انتخاب پر باضابطہ کام شروع کر دیا گیا۔ عاصم بٹ سے اس دوران لگاتار رابطہ جاری رہا۔ ان کے تعاون اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ انتخاب کرنا ناممکن تھا۔

ان دو ہستیوں کے بعد یارِ دیرینہ سید کاشف رضا کا تعاون بھی بنیادی اہمیت کا رہا۔ ہم دونوں نے خاصا وقت اس انتخاب کے بارے میں گفتگو کی اور کاشف رضا نے مجھے تقریباً پندرہ ایسے ناول دیے جو میرے پاس نہیں تھے اور جنھیں اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔ سو اس کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔ مجھے ان ناول نگاروں کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے مجھے اپنے ناول ارسال کیے۔

اس انتخاب کے لیے تین معروف سینیئر ادیبوں پر مشتمل ایک مجلسِ مشاورت بنائی گئی۔ جس کے ارکان میں انور سین رائے، ناصر عباس نیر اور مبین مرزا شامل ہیں۔ ان احباب سے فہرست سازی کے وقت اور انتخاب کے بعد مشاورت کی گئی۔ انور سین رائے نے ناہید سلطان مرزا اور عذرا عباس کے ناول انتخاب میں شامل کرنے کا مشورہ دیا لیکن ان کے ناول اس انتخاب میں شامل بیشتر لکھنے والوں کے مقابلے میں کم زور دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے انھیں

شامل نہیں کیا گیا۔ تمکین مرزا نے یونس جاوید کے ایک اہم ناول "کنجری کا پل" کو شامل کرنے کا مشورہ دیا جو صائب معلوم ہوا اور اسے شامل کر لیا گیا۔ ناصر عباس نیر نے انتخاب میں شامل مرزا حامد بیگ کے ایک کمزور ناول "انار کلی" کی نشان دہی کی اور اسے خارج کرنے کا مشورہ دیا۔ "انار کلی" مجھے بھی کم زور ناول محسوس ہوا تھا لیکن میں نے اسے بوجوہ شامل کر لیا تھا۔ ان کے خیال میں آزر مہدی کو اس انتخاب میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔ تو میں نے عرض کی کہ جناب وہ کل وقتی ناول نگار ہے اور ایک دلچسپ پیرائے میں لکھتا ہے۔ مجھے ناصر عباس نیر سے معذرت کرنی ہے کہ مجھے ریاض احمد کا "شجر حیات" ایک کم زور ناول محسوس ہوا اس لیے وہ شامل انتخاب نہ ہو سکا۔ ان تینوں اہم لکھنے والوں کی اہم اور بیش قیمت مشاورت کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

آخر میں اکادمی ادبیات، پاکستان کے چیئرمین، جناب یوسف خشک صاحب کے اعتماد اور بھروسے کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جو اگر شامل حال نہ ہوتا تو شاید یہ انتخاب پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا۔

ابوالفضل صدیقی-(1908-1987)

ابوالفضل صدیقی برطانوی ہند میں بدایوں کے نواح میں واقع عارف پور نوادہ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا معزز زمیندار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ ابوالفضل کے والد ابوالحسن صدیقی علی گڑھ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ معروف وکیل ہونے کے ساتھ شاعری بھی کرتے تھے۔ ابوالفضل کے والد نے انہیں بدایوں کے ایک مشن ہائی اسکول میں داخل کروایا۔ جس کے بعد وہ سینٹ جارجز کالج، مسوری میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوگئے جو اس وقت ہندوستانیوں کے لیے بہت مشکل تھا۔ سینیئر کیمبرج کے بعد واپس آکر انہوں نے اپنی زمینداری سنبھال لی۔

ابوالفضل اور ان کا خاندان چونکہ مسلم لیگی مشہور تھا، گھرانہ بھی مسلم روایت پسند تھا، پھر ان کی حویلی اطراف کے دیہاتوں میں پھوٹ پڑنے والے خونی فسادات سے متاثر ہونے والے مسلمانوں کی پناہ گاہ بن گیا تو گویا بہانہ ہاتھ آگیا۔ سازشی سازشوں کے جال بننے لگے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد حکومت ہند نے تنسیخ زمینداری کا قانون نافذ کر دیا جس سے ابوالفضل صدیقی کا دل اتنا برا ہوا کہ بالآخر 1954 میں ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ وہ کراچی کے علاقے پاپوش نگر میں آسودہ خاک ہیں۔

ابوالفضل صدیقی کا پہلا افسانہ "سماج کا شکار" ادبی دنیا، لاہور میں 1941 میں شائع ہوا جب کہ ان کا افسانوں کا پہلا مجموعہ 1945 میں اشاعت پذیر ہوا۔ شکار، زراعت، باغات اور جانوروں کو باریک بینی سے مشاہدہ، غرض جنگل اور دیہات سے متعلق ان کا سارا علم کتاب فطرت سے براہ راست اکتساب کا نتیجہ تھا جو ان کے لازوال افسانوں میں جھلکا اور ایک زمانے کو اپنا معترف بنالیا۔

ان کے افسانوں کے تقریباً آٹھ مجموعے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کے چار ناول اور ایک چار ناولٹوں کا مجموعہ بھی شائع۔ جارج آرویل کے مشہور ناول 1984 کے ترجمے کے علاوہ خاکوں اور آپ بیتی پر مشتمل کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ ابوالفضل صدیقی کی علمی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے افسانے "چڑھتا سورج" پر 1957 میں ان کو یونیسکو کا بین الاقوامی

ادبی انعام دیا گیا۔ ناولٹ "گم زمین کی تلاش میں" پر 1983 میں نقوش صدارتی ایوارڈ دیا گیا اور ناول "ترنگ" کی بعد از مرگ اشاعت پر 1989 میں انھیں نیشنل بک کونسل ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ اس انتخاب میں ان کے ناول "ترنگ" سے چند صفحات شامل کیے گئے ہیں۔

ناول "ترنگ" جاگیر داری کلچر کی مخصوص اقدار، سازشوں، سیر شکار اور عیش پسند رئیس زادے کے رومان کے گرد بنا گیا ہے۔ ان کی دیگر تحریروں کی طرح اس ناول میں بھی ان کی حقیقت پر مبنی دیہات نگاری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے دیہات کی معاشرت اور تہذیب کو تمثیلی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ دیہات، وہاں کے تمام طبقات، کسان، کھیت، مزدور، مہاجن، جاگیرداروں اور ان کے کارندوں، دیہاتیوں کے مسائل اور ان کی نفسیات... پھر جنگل، نباتات، جانوروں، چرند پرند، درندوں ان کی عادات و خصائص، جبلت اور انسان سے ان کے باہمی رشتوں کو جس طرح انہوں نے لکھا، وہ بلاشبہ اردو ادب کے سرمائے میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد ذخیرہ ہے ۔

"ترنگ" دیہات کے پس منظر میں نشہ بازی کے موضوع پر لکھا گیا ایک انوکھا اور منفرد ناول ہے۔ اس موضوع پر اردو میں ناول تو کیا افسانے بھی کم ہی ملتے ہیں۔ "چوہان گڑھ" ایک گاؤں ہے جہاں یہ کہانی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ناول کے دو مرکزی کردار ہیں، ایک شیوا جی چوہان اور دوسرا اس کا اکلوتا بیٹا ہرپال سنگھ چوہان۔ بیٹے ہرپال سنگھ کی نشے کی لت کی وجہ سے اس کا خاندان تباہی کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ کھیت اجڑ جاتے ہیں لیکن وہ اپنے کھیتوں میں خفیہ طور پر کاشت کردہ افیون فروخت کرنے لگتا ہے۔ جس کی وجہ پولیس کی کاروائی عمل میں آتی ہے اور باپ بیٹے کو حراست میں لے لیا جاتا ہے۔ مصنف نے ناول کو مرکزی اور ضمنی کرداروں کے ذریعے اس طرح آگے بڑھایا ہے کہ پورا ناول ایک سماجی دستاویز بن جاتا ہے۔

ترنگ

سال اشاعت:1989

ابوالفضل صدیقی

سورج بانس بھر بلند ہو چکا تھا، گھوڑی کا رخ چوں کہ گھر کی سمت تھا لہٰذا قدم مضبوط اٹھ رہا تھا اور رفتار مائل بہ سرعت تھی۔ یہ ذرا راسیں کھینچے ہوئے شام گوم چلا رہا تھا، میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ پانچ سات منٹ میں طے کر کے کچے راستہ پر ایک جگہ ایسی آئی، جہاں کنارے کنارے سرکنڈے کے جھنڈ اور گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی۔ وہ کامیابی کے احساس میں خوش خوش خوب تن کر ذرا بانکپن کے ساتھ زین پر بیٹھا تھا، جیسے نو عمر دولہا نو تیز رو دلہن بیاہ کر لاتا ہے اور پالکی کے پہلو بہ پہلو کس ادا کے ساتھ چلتا ہے اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ساری عمر کا توشہ جمع کر کے لا رہا ہے جیسے کوڑا کیا ہے کسی جاگیر کے ملنے کا پروانہ اس کی مٹھی میں رہا ہوا ہے کہ اتنے میں سیدھے ہاتھ سے جھاڑیوں میں سے ایک خرگوش اچھل کر راستہ کاٹتا بائیں جانب نکل گیا "گھرا (خرگوش) رستہ کاٹ گیا"!! دیہات میں بدشگونی کے لئے ضرب المثل ہے۔
اس کا ماتھا ٹھنکا۔ راس کے ذرا کھینچی ہی، جی میں آیا لوٹ جائے اور دوسرے رستہ گھوم کر جائے، پھر دل میں خیال آیا کیا حماقت، اور وہ اسی طرح نہایت اطمینان کے ساتھ اک ذرا ترچھا ترچھا جما ہوا چلتا رہا تقریباً میل بھر چلنے کے بعد ایک دم جیسے دائیں بائیں کی جھاڑیوں نے چار پانچ آدمی اگل دیئے اور وہ پورے چھ پولیس والوں کے نرغے میں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو وہ پہچانتا تھا۔
مشتبہ مشتبہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی آنکھیں چار ہوئیں، رسمی طور پر سلام دعا ہوئی اور ہیڈ کانسٹیبل نے کہا "ٹھاکر جی ذرا آپ تھانہ تک چلئے بڑے داروغہ جی نے آپ کو بلایا ہے۔"
ہرپال سنگھ کے بدن میں ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔
ہیڈ کانسٹیبل کے تیور بے ڈھب ہو رہے تھے۔ "کیوں؟"
اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم کچھ ضروری بات کرنی ہے، آپ چلیں معلوم ہو جائے گا۔"

"مگر اس گھڑی تو میں نہیں جا سکتا، مجھے فوراً گھر پہنچنا ہے"۔ بہت ہی سہل سی بات کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "میں گھر تک ہو آؤں، بس آنے جانے کی دیر ہو گی۔ مجھے خود بڑا ضروری کام ہے۔"

"مگر دروغہ جی نے کہا ہے کہ ابھی فوراً لاؤ۔"

"دروغہ جی کو میرا اسلام کر دیں آپ یہ کہ دیں کہ گھنٹہ بھر کے اندر گھر ہو کر آ جاؤں گا۔ ذرا دوا پہنچانی ہے، ماتا جی بیمار ہیں اور دوا میرے ساتھ چلی آئی جیب میں پڑی ہوئی"۔

"مگر ٹھاکر، کام تو سرکاری بھی بہت ضروری ہے اور آپ اک ذرا کے ذرا چلے چلیں۔ ایسا ہی ہے تو واپسی میں ذرا گھوڑی کو ایڑ دے دیں، بس وہاں تو کھڑے کھڑے کی بات ہے۔ ذرا سی بھی دیر نہ ہو گی۔"

"نہیں تو اس وقت تو میں نہیں جا سکتا۔" اس نے ذرا رکھائی سے کہا۔ مگر خوف کے مارے رنگت زرد پڑ گئی۔

تجربہ کار پولیس والوں نے موقع کی نزاکت کا اندازہ کر کے دونوں جانب سے گھوڑی کی لگام پکڑ لی۔ کیوں کہ ٹھاکر ہوا کے دامن پہ سوار تھا۔ اس کی ران تلے مشکی تھی، دور دس میل گھنٹہ بھر کی بہترین گھوڑی۔

"ٹھاکر جی یہ سرکاری ضابطہ ہے آپ کو چلنا پڑے گا۔"

"میں نہیں جاؤں گا"۔ اور یہ کہہ کر اس نے اپنا آسن بدل کر تربیت یافتہ گھوڑی کو شرارت کرنے کی ہدایت کی اور شائستہ گھوڑی نے کان گردن سے چپکا کر شرارت کا مخصوص نوٹس دیا جو ہر گھوڑے کی جبلت کا تقاضا ہے۔ پولیس والے ارادہ تو پہلے ہی بھانپ چکے تھے کہ سامنے لگام پکڑنے والے دونوں کانسٹیبلوں کو گرا کر بجلی کی طرح چمک کر جست کر گئی کہ بس پیچھے چاروں کانسٹیبل ادھر اُدھر سے رکابوں پہ جھپٹ پڑے اور ہرپال سنگھ کی پنڈلیاں مضبوط پکڑ لیں اور پاؤں رکابوں سے باہر نکال دیئے۔ اب اگر گھوڑی بھڑکتی ہے یا جست لگاتی ہے تو ٹھاکر صاحب کھسک کر پیچھے آپ آتے ہیں اور ان کے گرفت میں ہوتے ہی اس نے چمکار کر گھوڑی روک لی اور بگڑ کر کہا۔ "دیکھو جی یہ کوئی شرافت کی بات ہے! کیا میں چور ڈاکو ہوں؟! چھوڑ دو جانے دو، دور ہٹو الگ۔"

"سرکاری ضابطہ ہے، چلنا پڑے گا۔ ایسے نہیں چلو گے تو کھینچ کر لے جائیں گے یہاں سے وہاں تک بے عزتی مفت میں الگ ہو، ہاں آں" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"بڑا ضابطہ، ہٹو چھوڑو، ہم نہیں جائیں گے اور گھوڑی کو اشارہ کرنے کا انداز بنایا۔

"دیکھو اگر گھوڑی بدکائی تو ہم کو ضرور دھکا لگے گا مگر آپ بھی چتھیڑے کی طرح پیٹھ پر اکھڑ کر جا پڑیں گے، سمجھ لو، ٹھاکر جی" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

اس نے گھوڑی ٹھہرائی اور کہا، "گردن کاٹ دو، پر ہرگز نہیں جاؤں گا، کوئی لے تو جائے۔"

"اجی ٹھیری گردن کاٹنے ہم آپ کو صحیح سالم ابھی لے کر جائیں گے" اور پھر ایک کانسٹیبل جو آگے راس پکڑے ہوئے تھا، بڑبڑایا "اجی ہم کیا ضابطہ لے کر جائے گا۔" اور گھوڑی موڑنے کی کوشش کی لیکن گھوڑی مالک کی مرضی پہچان کر پتھر کی چٹان کی طرح جہاں کی تہاں جم کر رہ گئی اور صرف ایسا اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے کل واقعہ کی اہمیت مثل اپنے مالک کے سمجھ رہی ہے۔ اور یہ تو یقینی سمجھے ہوئے تھی کہ یہ چھیوں دشمن ہیں اور مالک ان کے پنجے سے چھوٹ کر فرار ہونا چاہتا ہے مگر شاید یہ نہ سمجھ پائی تھی کہ مالک جست لگانے کا حکم کیوں نہیں دیتا جو ان سب رہزنوں کو تنکے کی طرح بکھیر کر تیس فٹ آگے جا کر گردن اور چھلاوہ ہو جاؤں۔ اس میں شک نہیں کہ جست علم الحرکات کی بڑی ماہر تھی مگر بھلا بچاری کیا جانے کہ اگر رکابوں میں سے پاؤں نکال کر چار آدمی سوار کی پنڈلیاں دبا کر مضبوطی کے ساتھ گرفت میں لے لیں تو اس جست میں اور جھٹکوں کے ساتھ اس کا آقا بھی پشت زین سے اکھڑ کر پھونس کی طرح جا پڑے گا۔ نتھنے پھلا پھلا کر منہ میں کف لا لا کر بل کھا کھا کر رہ جاتی تھی اور بے قراری کے ساتھ حلق سے مخصوص مدہم مدہم آواز نکال کر حکم دینے کا تقاضا کر رہی تھی، ویسے آقا کی مرضی خوب سمجھے ہوئے تھی کہ کس قسم کے حکم کی توقع ہے بس ایک ذرا اشارہ کی منتظر تھی اور اس کی آواز اور مطالبہ کو ہر پال سنگھ ہماری زبان کی طرح سمجھ رہا تھا کہ خوشامد کے ساتھ اظہار اطاعت کر کر کے کہہ رہی ہے "میرے کنور جی بس ایک ذرا سا اشارہ کر دو تو ان چھیوں رہزنوں کو اپنے راستے سے دھول کی طرح اڑا کر ایک پل میں زمین کی طنابیں کھینچ لوں اور یہ تو یہ، سارے ضلع کی پولیس بھی پیچھے پڑے تو گرد کو بھی نہ پہنچے"۔

تجربہ کار ہیڈ کانسٹیبل نے راکب اور مرکب دونوں ہی کے بے ڈھب طور تاڑ لئے تھے کہ
تو وہ بارود ہو رہے ہیں، بس اک ذرا سی آنچ ملی اور ماتو بھک ہوئے۔ اور وہ تو یک دم ہتھکڑیاں جکڑ
لینے کی اچھی سوجھ گئی ورنہ اگر یہ ذرا سستی کر جائیں یا وہ ایک چند ثانیہ پیشتر خطرہ کی تہہ کو پہنچ
جائے تو بھلا ہم کہاں اور یہ کہاں۔ اور بس مارپیٹ پکار ہوتی رہتی۔ پھر بھی اور کچھ نہیں تو بات
کے کوئی دوسرا رخ اختیار کر جانے کا اندیشہ اس کے ذہن میں بار بار ابھرتا تھا۔ اس نے مدہم
آواز اور سنگین تیوروں سے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "دیکھو جی ٹھاکر ہرپال سنگھ، یہ سوچو، تم
ہمیشہ خاندانی خیر خواہ سرکار رہے ہو اور پولیس کے قوت بازو جیسے بڑے باپ کے بیٹے ہو ویسی
ہی بات کرو۔ ہمیں گستاخی پر مجبور نہ کرو ورنہ پھر ہم اپنا کار منصبی انجام دینے کے لئے سختی
کرنے پر مجبور ہوں گے۔"
"اچھا ہمیں وارنٹ دکھاؤ، لکھا ہوا کہاں ہے تمہارے پاس؟" ہرپال سنگھ نے گویا اپنے نزدیک
بڑے ضابطہ والی بات کہی۔
"دیکھو کنور جی بچکانی باتیں مت کرو، کوئی ہم تمہیں گرفتار کرنے کے لئے جا رہے ہیں جو وارنٹ
دکھائیں۔ ہم نے کہا نہیں دروغہ جی نے بلایا ہے اور حکم دیا ہے فوراً لے کر آؤ۔"
"ایں اور گرفتار کرنے کے سر پہ سینگ ہوتے ہیں بھلا، یعنی چھ آدمیوں نے میرا
اور گھوڑی کا جوڑ جوڑ بند بند جکڑ لیا ہے پھر ہم بھی یہیں کھڑے ہیں اور تم بھی۔ گھسیٹ لے تو
گھسیٹ کر لے جاؤ گھوڑی۔ یا پھر قانون کے اندر وارنٹ دکھلاؤ۔ جاؤ لکھا لاؤ دروغہ جی سے جا کر
اوں ایں ہم کوئی چور اچکے ہیں بھلا۔"
ہیڈ کانسٹیبل کو تاؤ آ گیا غضب ناک آواز میں بولا۔ "وارنٹ کیا چیز ہے؟ چلو ہم تمہیں پھانسی کا
حکم، عمر قید کا آرڈر سنوا دیں چلتا ہو تو بھلمنساہت سے چلے چلو، نہیں تو ابھی زین سے کھینچ کر
تمہاری گھوڑی کی باگ ڈور میں باندھ کر لے جائیں گے تو پھر کتنے کی رہ جائے گی سب
ٹھکرائت مٹی میں مل جائے گی اور ساری کرکری ہو جائے گی۔"
اور ہیڈ کانسٹیبل کے بے ڈھب تیور دیکھ کر اندیشہ ہوا کہ یہ عنقریب اشارہ کرنے
والا ہے اور ادھر ادھر کے کانسٹیبل جو ہتھکڑیاں جکڑے ہوئے ہیں زین پر سے نیچے گھسیٹ لیں

گے کچھ مرعوب سا ہو گیا۔ "اچھا تم بے عزتی پر اتر آئے ہو کیا تم ہمارے یہاں جاتے ہو تو تمہارے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں؟"

مگر ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں تیوروں سے کہا "بے عزتی پر ہم اتر آئے ہیں یا تم خود کرانا چاہتے ہو؟ چلتے کیوں نہیں کیا بات ہے اور پھر نرمی سے بولا چلو دیکھو عزت کے ساتھ بٹھائیں گے داروغہ جی کے برابر کرسی پر۔"

کوئی مفر نہ پا کر وہ آہستہ سے گھوڑی سے نیچے اتر آیا اور خاموشی سے کوتل گھوڑی اور ان سپاہیوں کے ساتھ تھانہ کا ڈیڑھ میل کا راستہ چپ چاپ پیدل طے کرنے لگا۔ جب تھانہ کوئی دو تین فرلانگ رہ گیا اور نیم برگد کے درختوں کا جھنڈ نظر آنے لگا تو دوپٹے کو ٹنکے کا سہارا، وہ ذرا ٹھہرا اور چپکے سے ہیڈ کانسٹیبل کو پچیس روپے جیب سے نکال کر تھما دیے اور صرف اتنا کہا "یہ اس وقت لو اور پچھتر شام کو منگا لینا، جانے دو"۔

ہیڈ کانسٹیبل نے عیارانہ لہجے میں چڑھتے تیوروں سے کہا "کنور جی یہ آپ رکھیں، اگر ایسی ضرورت ہوتی اور آپ کے گھر اتنا بھی بھیج دیتا تو مجھے یقین ہے کہ آپ ایسے ایسے پچیس، پچیس جگہ باندھ کر بھیج دیتے۔ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی کہ آپ یہاں نکال کر دکھاتے، مگر ہم مجبور ہیں کسی بھاؤ خود نہیں چھوڑ سکتے۔ بڑے داروغہ جی نے بلایا ہے اور ہمیں ہر قیمت پر ابھی سامنے پیش کرنا ہے اور آپ تو ناراض ہو گئے اور بات یہاں تک پہنچی۔"

"اور بات کیا ہے"۔ ہرپال نے مضطرب ہو کر کہا۔

ہیڈ کانسٹیبل چپ رہا اور اسی بحث و تمحیص میں وہ تھانہ کے اندر پہنچ گئے اور تھانہ کے پھاٹک کے اندر پہنچ کر تو جیسے وہ چوکڑی بھول گیا۔ وہاں کے سنگین ماحول سے بھانپ گیا کہ کسی طرح مخبری ہو گئی۔ دونوں افسر دفتر کے سامنے وسیع صحن میں برگد کے درختوں تلے مونڈھوں پر شان کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک بھدی میز پڑی تھی اور پیچھے چوکی پر ڈیسک کے سامنے ہیڈ محرر بیٹھا تھا۔ پہنچتے ہی دو سپاہیوں کو اشارہ سے تلاشی کا حکم دیا۔ ایک نے گھوڑی کی زین کے قبور ٹٹولے پھر عرق گیر تک ہر چیز کھول کر دیکھی۔ دوسرے نے ہرپال کی تلاشی لی۔ کوٹ اور قمیص کی جیبیں، پگڑی سے لے کر دھوتی کے پیچ اور پھر اک ذرا آڑ میں

لے جاکر حویلی کے اندر جا گھسے تنگ کی ہر سیون ٹٹول کر دیکھی اور کوئی چیز برآمد نہ ہوئی تو پھر بڑے داروغہ جی اٹھ کر اپنے کوارٹر میں گئے۔

استاد شجاعت خاں حقہ تھامے لیٹے ہوئے تھے، دیکھ کر اٹھ بیٹھے "ارے بھئی شجاعت خاں ویسے ہی پکڑ دلیا اس لونڈے کو، کوکین کی جو بس ایک خوراک اس کے منہ کے اندر ہے، وہ ہے اور کہیں پتہ نہیں ہے۔ اور تم نے بڑے اسٹاک کی مخبری کی تھی"۔

"ہاں میاں اسی کے پاس ہے جاؤ دیکھو۔

"دیکھیں کہاں سب زین ٹٹول لی کم بخت کو ننگا تک کرکے دیکھ لیا"۔

"اچھا نہیں ہے تو پھر چھوڑ دو جانے دو"۔ استاد نے ذرا طنزیہ تیوروں سے کہا۔

"انہیں استاد بتاؤ تو بھلا کہاں ہے؟ یہ باتیں چھوڑو کام ہونے دو"۔

"اچھا بھیا استاد شجاعت۔ اب یہ بتاؤ کہ یاروں کا کتنا حصہ رہے گا۔

"بھئی کوکین سب تمہاری جتنی بھی ہو اور ہم یہ گھوڑی لیں گے، اس کی شکل مدتوں سے ہمارے دل میں کھبی ہوئی ہے"۔

"تو پھر یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی ہزار روپیہ کا مال تو یہ گھوڑی ہے قاعدہ کی رو سے ڈھائی سو تو اس میں ویسے ہی میرے ہو گئے باقی اپنے افسر دوئم اور عملہ کا حساب آپ جانیں"۔

"وہ آپ فکر نہ کریں اگر گھوڑی ہاتھ آگئی تو ہماری ان کی مجرئی محسوب ہوتی رہتی ہے آگے کسی معاملہ میں کاٹ چھانٹ کر حساب چکتا کر لیں گے، آپ اپنی کہیئے"

"بھئی ڈھائی میرے ہونے چاہئیں۔"

"اچھا تو اسی سالے کو دبا کر ڈھائی سو اوپر اور دلاؤں گا۔"

"سو یقین رکھئے اس کے گھر میں ڈھائی سو ڈھائی روپیہ بھی نہیں نکلیں گے آج کی تاریخ میں ہاں البتہ پچیس روپیہ اس کی جیب میں پڑے ہیں۔ ابھی ابھی جو روکی تکڑی کی مکئی سنار کے یہاں گلوا کر لایا ہے ساڑھے سات سو روپیہ۔"

"اچھا استاد اگر اس نے خالی گھوڑی نری چھوڑ دی تو تمہارے ڈھائی سو ہم پر رہے آگے کسی معاملہ میں سمجھ لیتا ہوں ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں۔ یہ لو۔" استاد نے کہا اور ڈبیہ میں سے ایک پان نکال کر داروغہ جی کو دیا، دوسرا خود کھایا۔ پان کھا کر مطبوع سی آواز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

"پولیس افسر ہو، تلاشی لینا بھی نہیں آتی جا ہیئے کوڑے کے دستے میں سے نکال لو۔ ستر شیشیاں ہیں۔ دستہ توڑ نا مت، میں نے دو دن کی محنت میں بنایا ہے نیچے والی چنگل کی موٹھ پکڑ کر پہلے کھینچو پھر گھما نا، لمبی چوڑی کی ہوئی ہے کھلتی چلی جائے گی اور سب شیشیاں اوپر تک بھری ملیں گی۔"

داروغہ جی آہستہ آہستہ نکل کر اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ ہرپال سنگھ کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا اور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، کوڑا ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے ہرپال سنگھ کے ہاتھ سے کوڑا لے لیا اور گھما پھرا کر دیکھا، موٹھ پکڑ کر حسب ہدایت پہلے آہستہ سے تھوڑی کھینچی اور پھر پیچ کھولنا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے ساری شیشیاں میز پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سب کے چہرے خوشی کے مارے چمک اٹھے اور سب ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے لگے۔ بات یہاں تک تو پہنچ گئی تھی مگر درمیان میں کوئی پڑ کر معاملہ کرنے والا مناسب آدمی موجود نہ تھا۔ وہ خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ تھانہ دار نے سہولت کے ساتھ اس کو مخاطب کیا تو وہ اپنے منہ سے آواز نہ نکال سکا۔ اس نے بمشکل اپنی آواز سنبھال کر کہا۔ چوہان گڑھ آدمی بھیج کر دشنو سنگھ اور چتر سنگھ کو بلوا لو۔

اور بس یہی اس وقت داروغہ جی کی مرضی تھی کہ درمیان میں پڑنے کے لئے مناسب اور سمجھ دار ہو سکے تو مفید مطلب آدمی مل جائے سو ہرپال سنگھ نے خود ہی تجویز کر دیئے، چتر سنگھ کو داروغہ جی پہلے سے جانتے بھی تھے اور چتر سنگھ کو بلوا لو۔ اس کے کہنے کے مطابق داروغہ جی نے ایک سپاہی کو اپنی ذاتی گھوڑی پر سوار کرا کر دونوں کو بلانے کے لئے اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا کہ تیز جانے اور مجملاً صورت حال بیان کر کے فوراً ساتھ لائے۔ سپاہی کو چوہان گڑھ پہنچ کر دشنو سنگھ کے متعلق تو یہ معلوم ہوا کہ صبح ہی صبح ہرپال سنگھ سخت بیمار ہو گیا گاؤں کے وید داس نے جواب دے دیا تو شیو راج سنگھ مع عورتوں کے اس کو ساتھ لے کر شہر کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھانے لے گیا اور دشنو سنگھ اپنی گھوڑی پر ان کے ساتھ گیا ہے چتر سنگھ فوراً اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر ساتھ ہو لیا۔ تھانہ پہنچ کر دیکھا تو ہرپال سنگھ حراست میں ہے۔ کوکین کی شیشیاں میز پر ڈھیر ہیں، ہیڈ ماسٹر دانش ریکارڈوں کی طرح بھرے ہوئے پولیس کے مخصوص چینٹ خانہ ساز

گواہوں کا پورا ایک غول موجود ہے جو کوئی بیان بجز چشم دید کے دینا جھوٹ خیال کرتے ہیں۔
چتر سنگھ کو دیکھتے ہی دھاڑ مار کر رو پڑا۔ چتر سنگھ نے تسلی دی۔ اور علیحدہ سے جا کر بات کی ویسے
تقریباً سب کچھ اس کو راستہ میں اس سپاہی کی زبانی معلوم ہو گیا تھا جو اس کو بلا کر لایا تھا۔ اس
سے بات کر کے کل صورت حال سمجھ گیا اور اس کو معاملہ کی اہمیت سمجھائی جب وہ ہر پال سنگھ
سے بات کر رہا تھا تو درودھ جی نے بہ آواز بلند کہنا شروع کیا "اوہو! ملک نیہال ہے سرکار
انگریزی کا ہے کوئی ہے بھلا دیکھو تو اتنا بڑا اسٹاک، ستر شیشیاں، پورا خفیہ فروشی کا اڈہ قائم کر لیا
ہے میرے حلقہ کے اندر۔ مجھ لوگوں کا بھی سات برس کو پورے سات برس کو ایسا کیس اس
تھانہ کی تاریخ میں تو پکڑا نہیں گیا ہے۔"

ہر پال سنگھ سے بات کر کے چتر سنگھ درودھ جی کو لے کر خلوت میں گیا اور پھر ہر پال
سنگھ سے بات چیت کی اور بتایا کہ درودھ جی ایک ہزار نقد مانگتے ہیں اور ہزار روپے تو ہزار کوس
تک بھی نظر نہ آتے تھے اور پھر بھی اسی وقت یہ بھی نہیں کہ وہ چار گھنٹہ کے لئے چھوڑ دیں
اور سمجھل کرنے کا موقع ملے۔ یا تو مقدمہ قائم کریں گے یا فوراً روپیہ لیں گے اور ایسے کام ہاتھ
کے ہاتھ ہوا کرتے ہیں درودھ جی مشکی کے عاشق تھے ان کے سامنے تین سال سے سات
نسلوں کے میلوں کی نمائش میں بہترین جانور قرار دی جا رہی تھی اور وہ گھڑ دوڑوں میں اول
انعام پا رہی تھی بس ہزار روپیہ اور اسی وقت پر اڑ گئے۔ چتر سنگھ خود بھی ان کا اپنا ہی آدمی تھا
پھر چتر سنگھ کرتا بھی کیا اور ابھی اور ممکن ہی بجز مشکی کے ہزار کی صورت اور کوئی دوسری ہو بھی
کیا سکتی تھی۔ پہلے تو گھر پہ سلسلہ جنبانی کرنا بھی بے کار تھی نقد پیسہ اور پھر دس پچاس نہیں
پورے ہزار روپیہ حاصل کرنے کی مرتبہ تھے۔ پیام ادھر ادھر ہونے کے بعد یہ طے ہوا کہ
مشکی گھوڑی کی قیمت ایک ہزار قائم کی گئی آج اس وقت ہر پال سنگھ اس کو درودھ جی کے نام پر
بیچ کر دیں اور مہاجنیت والی انصاف کی بات یہ طے ہوئی کہ اگر ہفتہ بھر کے اندر ہزار روپیہ ادا
کر دیں گے تو گھوڑی واپس ہو جائے گی ورنہ نہیں اور اس معاہدہ کی تکمیل تک اور سو دو ہزار
روپیہ تک لے جانے کے لئے درودھ جی کو بار بار ہتھکڑیاں دکھا دکھا کر اور دو تین مرتبہ پہنا پہنا
کر بھی حوالات کے سیخچوں تک لے جانا پڑا کئی بار کھول کھول کر باندھ باندھ کر کھولنا پڑا۔ اور
ایک مرتبہ تو دیوان جی ہیڈ محرر نے مقدمہ درج کرنے کے لئے روزنامچہ کے ورق کی شکن

بھی توڑلی اور کان سے قلم نکال کر لکھنا بھی شروع کر دیا تھا اور گرج گرج کر تمام تھانہ سر پہ اٹھا لیا مگر چتر سنگھ نے قلم پکڑ لیا۔ مگر بجز اس کے گلے سے چند نکلنے کی اس وقت کوئی اور سوجھتی بھی تو نہ تھی۔ جب بات طے ہو گئی تو دروغہ جی نے تھانے کے محرر کو بلوایا اور اس سے باضابطہ سرکاری فارم رسید پر جو مویشیوں کی خرید و فروخت میں استعمال ہوتے ہیں، منگی کی رسید فروختگی کھلے بازار خوش خرید اپنے کسی معتمد کے حق اب کوکین کی شیشیوں کو سوال پیدا ہوا تو دروغہ جی نے کہا "میں اپنے حلقے میں ہزار روپیہ لے کر مسلسل ارتکاب جرم تو نہیں ہونے دوں گا۔ یہ ہزار روپیہ تو میں نے صرف اس کیس کو ختم کرنے کے پائے ہیں۔ یہ کوکین تو میں تلف کر دوں گا یا پھر کہیں سے آمدگی دکھا کر داخل مال سرکاری خانہ کر دوں گا"۔ اور اس بات پر جیسے ہرپال سنگھ کے سینہ کے اندر روح گھبرا کر باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈنے لگی۔ اس کو ایک ایک شیشی ایک منگی سے زیادہ عزیز تھی بات چیت کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ منگی کے ساتھ زین لگام گئی تھی تو گھوڑا کیوں نہ جاتا لیکن چتر سنگھ درمیان میں آیا تو کوکین کی قیمت مبلغ سات سو پچاس روپیہ قائم کی گئی تھی۔ دروغہ جی نے بکمال مہربانی اور عنایت خسروانہ سے سوا دو سو روپیہ اپنی جانب سے کم کر دیئے اور بقیہ پانچ سو کے لئے دو ہفتہ کی مہلت دے دی کہ ادا کر جائے اور مال اٹھا لے جائے۔ ساتھ ہی ساتھ دو شیشیاں جیسے بطور بانگی اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیں جو اس نے لپک کر مٹھی میں دبالیں اور پچیس روپے جو جامہ تلاشی کے وقت برآمد ہوئے تھے وہ رکھ لئے۔ کچہری برخاست ہوئی دروغہ جی اٹھنے لگے، سب کو جانے کا حکم ملا ۔ہرپال سنگھ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو منگی غائب تھی۔ ایک ذرا کے ذرا کچھ محسوس ہوا اس نے دھوتی کے پیچ سے اپنا انگوٹھا رگڑا جس پر ابھی تک اس چکنی سیاہی کا عکس باقی تھا، جس سے اس نے رسید بیع پر نشانی ثبت کی تھی۔ پھر ایک نگاہ دوڑائی چتر سنگھ اندر دفتر میں کھڑا دروغہ جی سے کچھ بات کر رہا تھا، وہ چل پڑا اور پھاٹک پر پہنچ کر ایک ڈبل خوراک والا پان کھایا اور ایک گہری سانس لے کر ادھر ادھر دیکھا اور چوہان گڑھ کے راستہ کی جانب بڑھا۔ شاید کچھ کچھ احساس ہوا کہ وہ عمر میں پہلی مرتبہ اتنی دور پیدل جا رہا ہے ورنہ اپنی بستی سے باہر نہ کبھی پیدل گیا تھا نہ کبھی پیدل آیا تھا۔ وہ تھانہ سے ملحقہ میدان پر سے گذرتی ہوئی پگڈنڈی پر ہوتا چوہان گڑھ جانے والی شاہراہ پر پڑ گیا بمشکل آدھے میل جا پایا ہوگا کہ پیچھے سے چتر سنگھ دروغہ جی سے اپنی

بات ختم کر کے آگیا اس کو پیدل چلتے دیکھ کر خود بھی گھوڑے سے اتر پڑا۔ اور گھوڑی کو کوتل لیے لگا پکڑے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اور چوہان گڑھ تک ساتھ ہی آیا۔

راستہ بھر دونوں میں بات چیت مختصر ہوئی آدھا راستہ طے کرنے کے بعد بر سبیل تذکرہ چتر سنگھ نے مجملاً بیان کیا کہ صبح ہی صبح اس کا بچہ بیمار ہو گیا۔ گاؤں کے دونوں ویدوں نے جواب دے دیا اور شفاخانہ لے جانے کی ہدایت کی تو اس کا باپ گھبرایا ہوا شنو سنگھ کے پاس دوڑا آیا۔ اور شنو سنگھ اپنی گھوڑی پر اور شیر راج سنگھ۔ بچے، بیوی اور بہو کو رتھ میں سوار کر کے شفاخانے لے گیا۔ اک منٹ فکر مند سا ہوا پھر کچھ اترتی سی محسوس ہوئی تو دوسرا پان کھا کر مطمئن ہو گیا۔

احمد بشیر-(1922-2004)

احمد بشیر اردو کے معروف صحافی، دانشور، ادیب اور فلم ساز احمد بشیر ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز لاہور کے ایک فلمی پرچے سے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کی حیثیت سے کیا۔ 1946ء میں بمبئی چلے گئے اور وہاں بھی ایک جریدے سے وابستہ رہے۔ 1947ء میں واپس لاہور آگئے اور پہلے "پاکستان ٹائمز" اور پھر "امروز" سے منسلک ہوئے۔ 1951ء میں حکومت سندھ سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں فلم سازی کی تربیت حاصل کرنے کے لئے امریکا چلے گئے۔ 1960ء کی دہائی میں انہوں نے ایک فلم "نیلا پربت" بنائی۔ یہ پاکستان کی دوسری فلم تھی جسے "صرف بالغان کے لئے" نمائش کا سرٹیفکیٹ ملا تھا۔ یہ ایک آرٹ فلم تھی، جسے سنجیدہ فلم بینوں نے بے حد پسند کیا مگر باکس آفس پر ناکام رہی۔ اس فلم کے تجربے کے بعد انہوں نے دوبارہ صحافت کا شعبہ اختیار کیا اور مساوات، مسلم، جنگ، ڈیلی نیوز، اسٹار اور فرنٹیئر پوسٹ سے وابستہ رہے۔ احمد بشیر کے خاکوں کا مجموعہ "جو ملے تھے راستے میں" اور سوانحی ناول "دل بھٹکے گا" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ احمد بشیر 25 دسمبر 2004ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔ وہ لاہور میں گلبرگ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔ 14 اگست 1994ء کو حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا تھا۔ اردو کی ممتاز افسانہ نگار نیلم احمد بشیر اور ٹی وی کی معروف اداکارہ بشریٰ انصاری ان کی صاحبزادیاں ہیں۔

ناول دل بھٹکے گا کی کہانی قیام پاکستان سے چالیس سال قبل یعنی برطانوی عہد میں گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے قصبے نور پور سے شروع ہوتی ہے اور قیام پاکستان کے تیس پینتیس سال بعد جنرل ضیاء الحق کے عہد میں ختم ہوتی ہے۔ اپنے مرکزی کردار جمال کے حوالے سے یہ ناول ستر برس کی مدت پر محیط ایک ہنگامہ خیز عہد کی داستان بن جاتا ہے۔ ناول کا پہلا ایک تہائی حصہ لاجواب ہے۔ جمال کا بچپن قصبہ نور پور میں گزرا ہے۔ اس کے حوالے سے پنجاب کی قصباتی زندگی اور معاشرت کی ایک مکمل اور بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے۔ احمد بشیر نے اس ناول کی بنت میں ایسے طاقتور اور مضبوط کردار تخلیق کیے ہیں جو زندہ اور معاشرے

میں چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ انہی کرداروں کے توسط سے اس عہد سے دور دور تک وسطی پنجاب کے معاشرہ کی روایتی تہذیب کے پرت کھلتے چلے جاتے ہیں۔ احمد بشیر کے ناول کی روداد پاکستان کے ایک چھوٹے گاؤں نما قصبہ سے بڑے شہر کی طرف ہجرت سے جنم لیتی ہے۔

پاکستان میں روایتی معاشرہ شکست و ریخت اور تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اس روایتی معاشرت کا اردو فکشن میں بار بار تخلیق کیے جانے کا عمل یقیناً معنویت رکھتا ہے۔ مرکزی کردار اپنے باپ کے ساتھ پنجاب سے کشمیر چلا جاتا ہے۔ کشمیر کی زندگی اپنی تمام تر خوبصورتی اور مکمل محرومیوں کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ کہانی کا تقسیم ہند کے واقعات سے متعلق حصہ بہت مضبوط اور گرفت میں لے لینے والا ہے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے وقت ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے مابین ہونے والے دل دہلا دینے والی کشمکش، ان تناظر میں ہونے والی قتل و غارت اور دیگر واقعات بہت تفصیل اور غیر جانبداری سے بیان کئے ہیں۔ لیکن ناول کا آخری نصف حصہ ذرا 'سپاٹ' محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یا تو مصنف نے یادداشتیں بیان کی ہیں یا سیاسی تبصرے لکھے ہیں لیکن یہ سب کچھ بھی خاصا پُر لطف ہے۔

دل بھٹکے گا

سال اشاعت: 2003

احمد بشیر

سرینگر میں برف پگھل چکی تھی مگر ڈل کا پانی ابھی بہت ٹھنڈا تھا۔ زونی حسب معمول آتی، جمال پر پانی کے چھینٹے اڑاتی اور معصومیت بھرے قہقہے لگاتی۔ جمال نے دیکھا کہ اس کا سینہ بھی بھر گیا ہے، کمر پتلی ہو گئی ہے اور آنکھوں نے باداموں کی گولائیاں اختیار کر لی ہیں۔ وہ ذرا کھنچ گیا۔ اسے اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسے زونی بہت اچھی لگتی تھی مگر وہ اس سے عشق کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہ اسے خطرناک بات لگتی تھی۔

مہینے بھر میں دھوپ میں تیزی آ گئی۔ بادام واری کے گاؤں پر جھڑ چکے تھے اور اب یہاں ہریاول کا دور دورہ تھا۔ گھروں کی ڈھلوان چھتوں پر لالے کے پھولوں اور کالے زیرے کے خودرو پودوں کی خوشبو نے دھوم مچا رکھی تھی۔ وہ موسم قریب تھا جب لوگ ڈونگوں میں جھیل کی سیر کو جاتے ہیں مگر اب کے سال سیر کو جانے کی بجائے خواجہ یسین نے مکان بدل لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کشمیریوں میں رہتے رہتے تنگ آ چکے تھے۔

جمال کی والدہ بھی پریشان رہتی تھی کیونکہ اس علاقے میں کوئی پنجابی خاندان آباد نہ تھا اور کشمیری اس کو آتی نہ تھی۔ انہوں نے امیرا کدل کے قریب یہاں سے کوئی تین میل دور ایک مکان کرائے پر لے لیا۔

جمال نے کشمیریوں کو پسند کرنا سیکھ لیا تھا۔ اسے امیرا کدل میں کوئی دلچسپی نہ تھی مگر اس سے کسی نے پوچھا ہی نہ تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد وہ سامان اٹھا کر چل دیے۔

لوٹ گئے ہیں ہم!

سامان باندھتے ہوئے جمال کی انگلی کٹ گئی اور خون کی ایک پتلی سی دھار بہہ نکلی۔ اس وقت کمرے میں زوبی کے سوا کوئی نہ تھا۔ ماستا کے جذبے سے بے اختیار ہو کر زوبی نے لپک کر اس کی انگلی منہ میں ڈال لی اور خون چوسنے لگی۔ جمال لذت اور اشتیاق سے ڈھیلا ہو کر اس پر جھک گیا۔ زوبی نے دوسرے ہاتھ سے گرتے کو تھام لیا تو اس کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔ اسکا دل چاہتا تھا کہ میرا خون بہتا رہے اور زوبی اسے چوستی رہے۔

تھوڑی دیر بعد زوبی نے خون تھوک دیا اور انگلی کو دیکھنے لگی۔ جمال نے آنکھیں کھول دیں۔ زوبی نے اس کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں شفقت، ہمدردی اور پیار کے دریا بہہ رہے تھے۔ جیسے گلاب کے بھرے ہوئے کٹورے شبنم سے لرز رہے ہیں۔

پتہ نہیں جمال کو کیا ہوا۔ جھپٹ کر اسنے زوبی کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے جیسے بچہ پھوڑے پر رکھتے ہیں۔ زوبی ہرنی کی طرح چوکڑی بھر کر اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ دیوار کے ساتھ لگ کر اسنے جمال کو غصے سے گھورا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ جمال کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چپ چاپ نیچے اتر گئی۔

سامان تانگے میں لادتے ہوئے جمال نے چور آنکھوں سے اس کا راستہ دیکھا مگر وہ الوداع کہنے کے لئے کمرے سے نہ نکلی۔ خواجہ یسین اور جمال کی والدہ سامان لادنے کے بارے میں جمال کو ہدایت دیتے رہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ظاہر تھا کہ زوبی نے اندر کی بات اندر ہی رکھی تھی مگر جانے سے پہلے جمال چاہتا تھا کہ ایک نظر زوبی پر ڈال لے۔

گھر کو چھوڑتے ہوئے جمال کو بڑی تکلیف ہوئی۔ تانگہ موڑ مڑنے لگا تو اس نے اپنے کمرے پر ایک آخری نظر ڈالی۔ کھڑکی کھلی تھی اور اس میں اداس زوبی چپ چاپ کھڑی جانے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ بلا سوچے سمجھے جمال نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ دیا۔ اس کے جواب میں زوبی کے چہرے پر آئی ہوئی موہوم مسکراہٹ کو جمال کے سوا کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔

ترقی کا راستہ!

خواجہ یسین نے جمال کو یقین دلایا کہ تم کبھی میٹرک پاس نہ کرسکو گے مگر کسی نہ کسی طرح اس نے یہ منزل سر کرلی اور خواجہ یسین نے اپنی پیش گوئی غلط ہو جانے کے بعد اسے کالج میں داخل کروا دیا۔ خواجہ یسین چاہتے تھے کہ جمال کسی نہ کسی طرح ایف اے کرلے تو پھر ان کا ایک دوست جو دہلی میں ڈپٹی سیکریٹری تھا اسے کلرک بھرتی کروا دے گا اور وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہے گا۔

اس زمانے میں یا تو نوجوان آئی سی ایس کا امتحان پاس کر کے افسر بن جاتے یا کلرک لگ جاتے تھے۔ وہ بھی اگر قسمت یاوری کرے۔ تیسرا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔

جمال آئی سی ایس پاس کرنے والا لڑکا نہیں تھا اور خواجہ یسین جو خود آئی سی ایس نہ بن سکے تھے، جمال کو بھی کئی سناتے رہتے تھے مگر وہ اس پر بھی خوش تھے کہ جمال تعلیم کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا میں جونیئر کلرک بھرتی ہو جائے۔

کالج میں ایک کھلا میدان تھا۔ یہاں پنجابی لڑکے بھی زیر تعلیم تھے مگر کشمیریوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کشمیری پنڈت اپنے حلقے سے باہر کسی سے بات نہ کرتے تھے اور ان کو اپنی تر دماغی کا بھی بڑا گھمنڈ تھا۔ ڈوگرے تھے۔ ان کو راج دربار پولیس اور فوج میں اپنی حیثیت کا بڑا غرور تھا۔ وہ جاہل، بد دماغ اور بزدل تھے۔ کچھ گلگتی، لداخی اور پونچھی بھی تھے مگر ان کو کشمیری ڈوگرے اور پنڈت پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ وہ بڑے غریب اور ڈرپوک لڑکے ہوا کرتے تھے۔ ان کو آتا جاتا بھی کچھ نہ تھا۔ قبائلی روایات کے مطابق ان میں سے بیشتر کے اخراجات ان کے والدین کی بجائے ان کی پنچایتیں چندہ کر کے ادا کرتی تھیں یا سرکاری جنگلات میں سے چیل اور دیودار کے درخت چرا کر پورا کرتی تھیں۔

کالج کی گراؤنڈ دنیا کی خوبصورت ترین گراؤنڈ تھی۔ ایک وسیع اور سرسبز میدان جس کے ایک کنارے پر لمبے لمبے سفیدے تھے، دوسری طرف چیڑ اور انار کی جھاڑیاں اور ان کے پیچھے ایک ٹیلے پر شنکر اچاریہ کا قدیم مندر، جس میں جمال کے جد امجد ڈیڑھ دو سو برس پہلے پروہت ہوتے تھے۔ کالج کی عمارت کے ارد گرد چناروں کے گھیر دار درختوں کی بھینی بھینی باس سے جنگل مہکتا تھا۔

اسکے پہلے حصے میں کرکٹ کی پچ تھی جس کے کھلاڑی زیادہ تر پنجابی بولنے والے لڑکے تھے۔ دوسرے حصے میں کشمیری ننگے پیروں سے فٹ بال کھیلنے والے، بائیں جانب ٹینس کورٹ جو جموں کے امیر ہندوؤں، ڈوگروں اور پروفیسروں کا مشغلہ تھا مگر کھیلوں میں بھی ہندو مسلمان کی تفریق صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

مگر وہاں بے چند بھی تھا۔

بے چند

بے چند کی بات ہی اور تھی۔

بے چند کوہاٹ کا ایک جوشیلا اور پھرتیلا لڑکا تھا۔ وہ بڑے گھیر کی شلوار اور چپل پہنتا اور اپنے پٹھان ہونے پر ناز کرتا۔ اگر اس کا نام بے چند نہ ہوتا تو سب لوگ اسے مسلمان سمجھتے۔ جمال سے اس کی دوستی ہو گئی اور اس کی بڑی وجہ پنجابی زبان تھی۔

جمال اس کے گھر میں بیٹھا تھا کہ اسے پیاس لگی۔ بے چند اسکے لئے پانی لایا مگر گلاس کے بجائے چائے کی پیالی میں۔

"پیالی میں پانی کیوں لائے بے چند؟" جمال نے پوچھا "گلاس بھر کے لاتے تو میری سیری ہو جاتی۔"

"اس لئے کہ یہ مٹی کی ہے۔ اسے توڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔ گلاس بھرشٹ ہو جائے تو اسے توڑا نہیں جا سکتا۔ میری دادی کہتی ہے کہ تم اپنے مسلمان دوستوں کو رسوئی کے برتنوں میں کھلا پلا دو گے تو میں کیا کروں گی تمہارا؟" یہ کہہ کر وہ چیخنے لگا۔

"تمہاری دادی اس قدر پرہیز کرتی ہے مسلمانوں سے۔"

"وہ تو لکڑیاں بھی دھو کر جلاتی ہے۔ لکڑہارے مسلمان ہوتے ہیں نا"۔

پوتر پنڈت

کشمیری پنڈت بڑے سخت مذہبی تھے مگر انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا۔ وہ پیروں، فقیروں سے بھی عقیدت رکھتے تھے اور آستانوں، درگاہوں کی سیڑھیوں پر سیندور لگا کر دور ہی سے پرنام کر لیتے تھے۔ خود وہ شولنگ کے پجاری تھے۔ سرعام بھی چھوٹے چھوٹے چبوتروں میں لیوترے پتھر رکھے رہتے تھے جن پر وہ دریا میں اشنان کے بعد گیندے کے پھول اور سرسوں کا تیل چڑھاتے۔ یہی ان کی پوجا کا پاٹ تھا۔

مسلمانوں نے بھی کشمیری پنڈتوں کے ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا۔ دراصل وہ سب انہی پنڈتوں کی اولاد تھے اور انہوں نے راجا رنچن شاہ کے زمانے میں استصواب رائے سے فیصلہ کیا تھا کہ لداخ کے بدھ مت، کشمیر کے ہندو مت اور ایران کی آتش پرستی کے مقابلے میں اسلام ایک بہتر ضابطہ حیات ہے جس سے انسانوں میں اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے اور مل بانٹ کر کھانے کا کلچر پیدا ہو جاتا ہے (افسوس کہ اس بات پر عمل نہ آیا) مگر کشمیری مسلمانوں نے شولنگوں کو کبھی توڑنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی تھی۔ ان میں آشتی کی وجہ تو ان کی نسل کا سانجھ تھا۔ دوسرے کشمیری زبان تھی جو ان کو جموں کے ہندوؤں اور ڈوگروں کے مقابلے میں ایک قوم کا تصور دیتی تھی مگر کچھ تضاد بھی تھا اور اس کی وجہ پنڈتوں کا راج دربار میں فضیلت پانا۔

علم میں برتری حاصل کرنا اور نسبتاً خوش حال ہوتا تھا۔ مسلمان اپنے پنڈتوں کا دل سے احترام کرتے تھے۔ کچھ اس کی وجہ ان کا فارسی پر عبور بھی تھا۔

جمال اکثر سوچا کرتا کہ میرے جد امجد جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا، پتہ نہیں سرینگر میں کہاں رہتے تھے اور کیا انکی نسل ابھی چل رہی ہے یا نہیں۔ اسے شنکر اچاریہ کا مندر دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔

وہ اس کے پروہت سے ملنا چاہتا تھا۔ شاید وہ کسی حوالے سے اس کا رشتہ دار نکلے۔

شنکر اچاریہ کا مندر جھیل ڈل کے کنارے پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر براجمان تھا۔ راستہ کچا اور پیچ دار تھا۔ دو ڈھائی میل کی چڑھائی کے بعد آدمی مندر کی سیڑھیوں تک پہنچتا تو اسکی سانس پھولی ہوتی۔ راستے میں بیٹھنے اور دم لینے کی بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ کوئی چشمہ بھی نہیں تھا کہ پیاس بجھ سکے۔ کوئی ساتھ جانے والا بھی نہ تھا۔

جمال پہاڑی پر اس وقت چڑھا جب پوجا کا وقت گزر چکا تھا۔ راستہ سنسان تھا۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گھڑے ہوئے پتھروں کی ایک قدیم عمارت کھڑی ہے جس کے آس پاس زندگی کے کوئی آثار نہیں۔ یہ مندر ہزار سال پرانا بھی ہو سکتا تھا اور شاید اس سے بھی زیادہ۔ سلیٹی رنگ کے گھڑے ہوئے پتھروں سے اس کی قدامت کا اندازہ ممکن نہ تھا۔

سیڑھیوں کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ جمال وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

ساٹھ ستر پتھریلی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد یہ ایک چھوٹی سی گول عمارت تھی جس کے چاروں طرف چلنے کے لئے تھڑے بنے ہوئے تھے۔ مندروں کی تعمیر مسجدوں، گورداروں اور گرجوں کے برعکس اس انداز سے کی جاتی ہے کہ اس میں داخلے کا ایک ہی راستہ ہو اور اسی راستے سے لوگ واپس جائیں۔ ہندو مت میں کشادگی نہیں اور ان کی عبادت گاہیں کسی دوسرے کو برداشت نہیں کرتیں۔

جمال کو پتہ تھا کہ مسلمان مندروں کے اندر نہیں جا سکتے مگر وہ اندر جانے اور پروہت سے بات کرنے کے لئے بے چین تھا۔

اگر اس میں عقل ہوتی تو وہ ر کے بغیر سیدھا مندر کے اندر گھس جاتا اور یہ ظاہر نہ کرتا کہ میں مسلمان ہوں مگر اس میں عقل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بوڑھا کاہن ننگے بدن مالا پہنے مندر سے برآمد ہوا اور جمال کو دیکھ کر واپس چلا گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جمال مسلمان ہے، پھر وہ مندر کے بیرونی چبوترے پر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا جیسے جمال کی نگرانی کر رہا ہو۔

جمال مندر کے اندر لازماً جانا چاہتا تھا۔ جب پروہت مندر کے عقب کی طرف گیا تو وہ لپک کر مندر کے دروازے تک جا پہنچا۔

اندر عضو تناسل کی تمثیل کالے رنگ کا گھڑا ہوا شولنگ رکھا تھا جو اسے کئی مرتبہ سڑک کے کنارے پر استھانوں میں پڑا دیکھا تھا۔ اس کی نوک پر گیندے کے کچھ پھول رکھے تھے مگر گھی اور تیل کی میل بھی اس پر چمک رہی تھی۔ ہر بل کے دھویں نے اس پر گاڑھی سیاہی پھیری ہوئی تھی۔ یہ شو جی مہاراج کا ایک گندہ اور بدبودار عضو تناسل تھا۔

وہ ابھی کھڑا دیکھ ہی رہا تھا کہ پنڈت جی مندر کا چکر لگا کر سامنے آ گئے اور جمال کو مارنے کو لپکے۔ جمال کھٹ کھٹ کھٹ سیڑھیاں اتر گیا اور پیچھے چیخ کر بولا "پنڈت جی مہاراج اس مندر میں کبھی میرے بزرگ بھی کاہن ہوتے تھے۔ آج تم اس غریب کو مارنے کو دوڑتے ہو۔"

"تم بکتے ہو" ۔ پنڈت جی غرا کر بولے "تم مسلمان ہو۔ تمہارے بزرگوں کا یہاں کیا کام؟ تم نے شنکر اچاریہ کا استھان بھرشٹ کر دیا۔"

"میں مسلمان ہوں مگر دو ڈھائی سو سال پہلے برہمن ہوتا تھا"۔ جمال نے چیخ کر کہا۔

"تم نے پچھلے جنم میں پاپ کئے ہوں گے۔ اسی لئے اب ملیچھ پیدا ہوئے۔ کرموں کے چکر سے کون بچا ہے آج تک؟"

"میں نے اچھے کرم کئے ہوں گے اسی لئے مسلمان پیدا ہوا۔ یہ اعلیٰ مقام ہے پنڈت جی۔"

"اچھے کرم کرنے سے کسی کا مقام گرتا نہیں، بڑھتا ہے مورکھ۔ مسلمان ہو کر اونچے مقام سے نیچے آ گئے تم اور اب جنم جنم دکھ بھگتتے رہو گے۔ تمہاری آتما کبھی شانت نہیں ہو گی۔ تم نے بھگوان کا استھان بھرشٹ کیا۔ اب مجھے یہاں ہون کرنا پڑے گا۔ صندل جلانا پڑے گا اور سیڑھیوں تک کو دھونا پڑے گا اور یہاں پانی ہے نہیں۔ تم نے بڑا پاپ کیا اندر آ کر۔ تمہارے بزرگ برہمن نہیں ہو سکتے۔ برہمن کبھی بھولے ناتھ کے استھان کو بھرشٹ نہیں کر سکتا۔ اب دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں ڈنڈے ماروں گا۔"

مگر جمال نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں پنڈت جی کے سوا اور کوئی نہیں اور ان میں اتنی جسمانی طاقت نہیں کہ وہ سیڑھیاں اتر کر مجھ پر حملہ کریں۔ وہ بیٹھ کر مسکراتا رہا۔ بولا "پنڈت جی میں تو یہاں بیٹھا ہوں اور ایک مرتبہ اور بھگوان کے درشن کروں گا۔ آ کر مجھے ڈنڈے مارو۔"

پنڈت جی بھی جانتے تھے کہ یہاں وہ اکیلے ہیں اور وہ ایک جوان اور صحت مند مسلمان کو مار نہیں سکتے۔ اس لئے وہ سیڑھیوں کے اوپر ہی کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے گالیاں دینی شروع کر دیں اور شراپ دینے لگے۔ آخر میں منت سماجت پر اتر آئے۔ "دیکھو اگر

تمہارے بزرگ واقعی برہمن تھے تو جو کچھ تم نے کیا ہے اس سے ان کی آتما دکھی ہوگی۔ اب تم چلے جاؤ۔ دیا کرو۔ کرپا کرو۔ مجھے استھان کو دھونا اور پوتر کرنا ہے۔"

جمال کو اس کمزور بوڑھے پر بڑا ترس آیا۔ وہ بہت دکھی ہو رہا تھا۔ وہ دوائی ممکل پیچھے جا کر پانی لانا اور مندر کو دھونا کیا اسکے لئے کم مصیبت تھی پھر جرم کا احساس کہ اس نے شوجی کے استھان کی حفاظت نہیں کی۔ اس نے اسے مزید چڑانے کے لئے کہا "مگر تم خود کون ہو پنڈت جی۔ برہمن تو نہیں لگتے مجھے۔"

"اندھے ہو۔" پنڈت جی غصے سے بولے۔ "بھگوان کے داس سے پوچھتے ہو کہ تم کون ہو۔"

جمال نے نہایت پر سکون ہو کر کہا "تم بھگوان کے داس نہیں لگتے۔ بھگوان کے سالے لگتے ہو۔ تم حلوے مانڈے کے داس ہو پنڈت۔ بولو مجھے مندر کے اندر جانے کے لئے کیا دینا پڑے گا؟ ار دو پیہ کہ اٹھنی؟"

"دھت تیرے کی۔ ملیچھ بدمعاش!" پنڈت جی کھٹا کھٹ سیڑھیاں اترنے لگے مگر آخری سیڑھی پر آکر رک گئے۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ "شو شنکر شو شنکر" انہوں نے نعرہ مارا۔

پنڈت جی کشمیری نہیں تھے۔ ان کے لہجے سے بنارس کے پنڈوں کی بو آرہی تھی۔ وہ یوپی کے پنڈتوں کی طرح لفظ چبا چبا کر بولتے تھے۔ جمال نے کھائی اترتے ہوئے سوچا ممکن ہے میرے بزرگوں کے قبول اسلام کے بعد یہ گدی کشمیری پنڈتوں سے چھن گئی ہو۔ ممکن ہے کہ موجودہ کاہن کے کسی دادا پر دادا کو مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ بنارس سے لے آیا ہو کیونکہ وہ کشمیری پنڈتوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا مگر پھر میرے بزرگ اور ان کے رشتہ دار کہاں گئے۔

جمال باتوں باتوں میں اپنے پنڈت ہم جماعتوں سے انکی ذاتوں، گوتوں اور خاندانوں کے بارے میں پوچھتا رہتا۔

جمال کو معلوم تھا کہ کشمیری پنڈت اپنے مخصوص محلوں اور تنگ گلیاروں میں رہتے ہیں۔ زیادہ تر حبہ کدل اور نالہ شیر گڑھی کے اس کنارے پر جو پرانے شہر کو الگ کرتا ہے۔ وہ نالے کے کنارے چلتے ہوئے اکثر سوچتا کہ میں کون ہوں۔ کیا میرے بزرگوں کی ہندو نسل زندہ ہے؟

پنڈت بہت صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے۔ سروں پر پیچ دار پگڑیاں، پشمینے بڑے بڑے سفید پھرن اور چست چوڑی دار پاجامے میں وہ تول تول کر قدم رکھنے کے عادی تھے۔ ان کی عورتیں زیادہ تر عنابی رنگ کے پھرن زیب تن کرتی تھیں۔ سروں پر گول ٹوپیاں جن پر ان کی چھوٹی چھوٹی چٹریاں لگی ہوتی تھیں۔ انکو اپنے وقار کا شدید احساس تھا۔ باہر نکلتی تھیں تو کسی سے بات نہ کرتی تھیں۔ جوان پنڈت بالعموم داڑھی منڈواتے تھے مگر بوڑھے داڑھیاں رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پوجا پاٹ اور فارسی اور سنسکرت کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ علوم نجوم میں انہیں بہت کمال حاصل تھا۔ بہت سویرے جمال پنڈتوں کو نالے کے گھاٹ پر اشنان کرتے اور گیندے کے پھول بھینٹ کر کے پانی میں بہاتے دیکھا کرتا۔

وہ مسلمانوں سے دامن لپیٹ کر ہی چلتے تھے مگر شاہ ہمدان کی خانقاہ کی سیڑھیوں پر سیندور مل کر پرنام کرتے تو ان کی آنکھیں بھی پر نم ہو جاتی تھیں۔ کشمیری مسلمانوں کی طرح وہ بھی تصوف کی طرف مائل تھے۔ شو جی کی پوجا کے باوجود انہیں بھی توحید کا گیان تھا۔ وہ اپ نشدوں کے بڑے سنجیدہ طالب علم تھے۔

میں کون ہو؟

ایک دن جمال نے شام لال پنڈت سے جو کرکٹ بھی کھیلتا تھا، پوچھ لیا، "کیا تم کسی کوشل برہمن خاندان کو جانتے ہو؟"

"کوشل برہمن سرینگر میں کوئی نہیں۔ کیا تم نے جنم پتری بنوانی ہے؟" شام لال نے کہا "یہاں جیوتش کے ماہر اور پنڈت بھی ہیں"۔

"میں یہ جاننا ہوں کہ میں کون ہو؟"

"الحق تم پچھلے جنم میں کون تھے مگر مسلمان تو آواگون کو نہیں مانتے، تم مانتے ہو کیا؟"

"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میرے پردادا کا دادا کون تھا۔ وہ شنکر اچاریہ کے پروہت تھے پھر مسلمان ہو گئے۔ ہم کوشل برہمن تھے شام لال۔"

شام لال حیرت سے جمال کا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا "یہ تو دو سو برس پرانی بات ہوئی اب کس کو پتہ ہوگا؟!"

"میرے خاندان کا شجرہ صرف میرے پردادا کے دادا تک سلامی نام بتاتا ہے اسکے ساتھ ہی کچھ گواہوں کے نام ہیں جن کے سامنے اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیوں مسلمان ہوئے تھے؟"

رات جمال نے بے چینی سے گزاری۔

اگلے روز شام لال نے آتے ہی کہا "کوشلوں کا ایک پرانا خاندان تو اب کدل کے پاس رہائش پذیر ہے۔ میرے پتا جی نے بتایا۔ پنڈت وشوا ناتھ خاندان کا بزرگ بہت بڑا جوتشی ہے اور صوفی آدمی مشہور ہے۔"

جمال پوچھتے پوچھتے اس کے گھر جا پہنچا۔

ساوتری بہن

دستک کی آواز سن کر ایک زرد رنگ کی جوان لڑکی نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا اور جمال کو دیکھ کر بات کئے بغیر دروازہ بند کر لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ لڑکی چوبارے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ وہ بہت نرمی سے دروازے پر ہاتھ مار رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ نیچے اتری اور دروازہ کھولے بغیر کشمیری میں بولی "کسو چھو"۔

جمال نے اردو میں کہا "میں پنڈت دشواناتھ کو شل کو پرنام کرنے کے لئے آیا ہوں۔ کیا وہ گھر پر ہیں؟"

تھوڑی سی خاموشی کے بعد لڑکی بولی "کام کیا ہچھس ؟

اب جمال کیا بتاتا۔ اس نے کہا "بہن جی یہ میں پنڈت جی کو بتاؤں گا۔"

لڑکی جواب دیئے بغیر ہٹ گئی۔ جمال کھڑا رہا۔

کچھ دیر کے بعد وہ واپس آ کر بولی "پنڈت جی بولے تم تیج کے سے آؤ۔ پھر وہ تمہاری پتری بنادے گا"۔ اور یہ کہہ کر وہ جانے کو مڑی۔

جمال جلدی سے بولا "بہن جی مجھے پتری نہیں بنوانی۔ پنڈت دشواناتھ میرے بزرگ ہیں ان کے درشن کو آیا ہوں۔ میں بھی کوشل برہمن ہوں۔"

لڑکی نے دروازہ کھول دیا اور ایک بچے کی طرح حیران ہو کر بولی "تم کوشل برہمن کس طرح ہو گیں گا۔ تم مسلمان ہے تم پنڈت ہے۔"

"بے شک میں مسلمان ہوں اور پنجابی ہوں مگر میں کوشل برہمن ہوں۔ میرے پردادا کے دادا مسلمان ہو کر سرینگر سے پنجاب چلے گئے تھے وہ شنکراچاریہ کے کاہن تھے۔"

لڑکی نے جمال کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر حیران ہو کر بولی "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اور لپک کر واپس چلی گئی۔

بہت دیر ہو گئی جمال کو گمان ہوا کہ اب وہ نہیں آئے گی مگر وہ دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی، اس لئے وہ امید لگائے ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ بالآخر وہ آئی اور بولی۔ "پنڈت جی نے اوپر بلایا ہے۔"

تنگ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر گیا تو لکڑی کے فرش پر بچھے ہوئے ایک نمدے پر پنڈت وشوا ناتھ کوشل بیٹھے تھے عمر کوئی اسی کے لگ بھگ بال چاندی کی طرح سفید داڑھی لمبی اور رنگ پیلا جیسے طاق میں رکھی ہوئی موم بتی۔

جمال نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

پنڈت جی کچھ دیر اس کو گھورتے رہے۔ پھر انہوں نے اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

جمال نے جوتی اتاری اور دوزانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بولو مہاراج کیا سنکٹ ہے؟" انہوں نے کہا۔

"پنڈت جی میں ذات کا کوشل برہمن ہوں۔" جمال نے منت کر کہا "میرے دادا کے دادا پنڈت کاشی ناتھ کوشل دو سو برس پہلے مسلمان ہو کر لاہور چلے گئے تھے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اب یہاں کوئی ہمارا رشتہ دار ہے؟"

پنڈت وشوا ناتھ کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔ وہ سوچتے رہے اور زیر لب بولتے رہے۔ "پنڈت کاشی ناتھ کوشل پنڈت کاشی ناتھ کوشل۔"

جمال بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کا جسم تنا ہوا تھا۔ لگتا تھا اس کا بدن ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اچانک پنڈت جی نے سر اٹھایا اور آواز دی "ساوتری۔"

ساوتری کونے میں کھڑی یہ عجیب تماشا دیکھ رہی تھی، پنڈت جی بولے "مدھر (میٹھا) قہوہ لا۔ چینی پیالی میں۔ بھگوان کی کرپا خود چل کر ہمارے دوارے آئی ہے۔"

ساوتری حیرت سے پنڈت جی کا منہ تکنے لگی۔ کشمیری پنڈت اپنے گھر میں مسلمان کو چینی کی پیالی میں میٹھا قہوہ نہیں پلاتے۔ اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر پنڈت جی بولے "جاؤ سو ساوتری!"

لڑکی باورچی خانے میں چلی گئی۔ جمال کو افسوس ہوا کہ میرے جانے کے بعد پنڈت جی کو چینی کی پیالیاں توڑنی پڑیں گی مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔

پنڈت جی نے پھر سر جھکا لیا اور زیر لب کہنے لگے "بھگوان تیری لیلا نیاری ہے۔ بھوکی ہے ہو۔ تمہارا کیا نام ہے بالک؟"

"جی مجھے جمال کہتے ہیں"

"پنڈت کاشی ناتھ کول تمہارے کیا لگتے تھے؟"

"جی وہ میرے پردادا کے دادا تھے۔ میں ان کے بڑے بیٹے کی اولاد میں سب سے بڑا ہوں۔ مجھے اپنی تلاش ہے مہاراج بتایئے میں کون ہوں؟"

"تلاش تم بھگوان کی کرو پنڈت جی۔ پھر اپنا آپ بھی مل جاتا ہے مہاراج!"

پنڈت دشوناتھ نے جمال کو پنڈت جی کہہ کر مخاطب کیا تو اس کے گال تمتمانے لگے "جیسا حکم"۔

اس نے دبی زبان سے کہا۔

"علم بھی اسی کا ہے جو تینوں لوکوں کا مالک ہے وہی ترلوکی کا ناتھ ہے وہی آگے پیچھے، وہی دھرت، وہی کرت، وہی پربھو، وہی پجاری، وہی کھیل، وہی کھلاڑی، چندرماں سورج منگل برہسپت، دیوی، دیوتا سب اسی کے جلوے ہیں۔ وہی تو ہے مولانا روم کو نہیں پڑھا تم نے؟"

"جی نہیں"

"مولانا روم کو پڑھو۔ فریدالدین عطار کو پڑھو۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔"

"بجا ارشاد"۔ جمال نے کہا۔

پنڈت جی دھیرے دھیرے مسکرانے لگے۔ ان کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اتنے میں ساوتری سماوار اور چائے کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں لے آئی۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی باقر خانیاں بھی۔ اس نے بڑے سلیقے سے ابلتا ہوا قہوہ پیالیوں کے کناروں تک بھر دیا اور ادب سے ہٹ کر ستون کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

دفعتاً پنڈت جی ساوتری سے مخاطب ہو کر بولے "یہ تمہارا بھائی ہے۔ کیا نام"

"جمال جی۔ جمال دین کوشل" جمال بولا۔

"پنڈت جمال دین کوشل ہمارا بچہ ہے ساوتری۔ تمہارا جنم کا بھائی۔ خون کا بندھن ہے تمہارا۔" ساوتری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پنڈت وشوناتھ مسکرا کر بولے "بھگوان کے چلتر تو دیکھو ذرا۔ کس کو یہاں بھیج دیا۔ پنڈت جمال دین کوشل ہمارے بزرگ پنڈت کاشی ناتھ کوشل کی پانچویں استھان سے ہیں۔"

"کون پنڈت کاشی ناتھ کوشل بابا؟" ساوتری حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"یہ تمہارے جنم سے پہلے کی بات ہے ساوتری میرے جنم سے بھی پہلے کی۔ پنڈت کاشی ناتھ کوشل بھگوان شنکر اچاریہ کے داس تھے۔ ہمارے دادا کے تایا۔ مسلمان

ہو کر وہ ہمیں چھوڑ گئے۔ پنڈت جمال دین کو شل اب تم خود آ گئے ہمارے دوار پہ، دیکھو بھگوان کا کھلنڈرا پن!"

"وہ مسلمان ہو گئے تھے؟" ساوتری نے پوچھا۔ "پر کیوں؟"

"بھگوان کی چھا۔" پنڈت جی بولے۔ "سب دین دھرم اسی کے تو ہیں۔ وہ بڑا نٹ کھٹ ہے۔ ہمارے پتاجی مہاراج کہتے تھے پنڈت کاشی ناتھ سورگباشی بہت اچھے لوگ تھے۔ سادھوؤں، صوفیوں کی سیوا ان کا دھرم تھا۔ خود بھی بڑے مہاگیانی تھے۔ انہوں نے من کو بھگوان کی رچنا سے ایسا سجایا کہ ایک مسلمان فقیر نے جو بہت پہنچا ہوا بزرگ تھا، پنڈت کاشی ناتھ کو شل کی مونڈی پکڑلی کہا جاتا کہاں ہے۔ وہ کوئی دیوتا ہو گا جو پنڈت کاشی ناتھ کو شل کو انگلی لگا کر لے گیا۔ پھر ان کی خبر نہ ملی۔ اب ایسے دھرماتما کہاں ملتے ہیں!"

اور اس بات پر پنڈت دشوا ناتھ کف افسوس ملنے لگا۔

جمال کا ذر جاتا رہا۔ وہ قہوہ پینے لگا تو اس کے ہونٹ جل گئے۔ ساوتری کھلکھلا کر ہنس دی۔ "غلطی کر کے بیو پنڈت جی۔" پنڈت دشوا ناتھ نے کہا "ہو سکتا ہے کہ تم میں پنڈت کاشی ناتھ جی کی آتما براجمان ہو گئی ہو۔ کیا تم اس کا منہ جلاؤ گے؟"

جمال شرمندہ ہو گیا اس کے لئے یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ حقیق ہے۔ ایسی باتیں تو صرف کتابوں میں ملتی ہیں۔

پنڈت دشوا ناتھ نے کوئی بات سنی نہ تھی۔ وہ ایک پرانی الماری میں سے بہیا پوتھیاں اور رجسٹر نکالنے لگے۔ ان پر برسوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ پنڈت جی مٹی جھاڑتے، انھیں کھول کر دیکھتے اور رکھ دیتے۔

اختر رضا سلیمی (1971)

اختر رضا سلیمی کیکوٹ، ہری پور، خیبر پختون خوا میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی نام سردار محمد پرویز اختر ہے۔ انہوں نے میٹرک کراچی سے کیا اور اس کے بعد راولپنڈی سے انٹر پاس کیا۔ بعد ازاں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے گریجویشن اور سرگودھا یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ 2006ء میں انہوں نے اکادمی ادبیات، پاکستان میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا جہاں وہ اردو ایڈیٹر کے طور خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ سہ ادبیات کے مدیر بھی ہیں۔

ان کی پہلی پہچان ایک شاعری کی ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے "اختراع" اور "ارتفاع" شائع ہو چکے ہیں۔ 2014ء میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "خواب دان" کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ 2009ء میں ان کے یہ دونوں شعری مجموعے خوشبو مرے ساتھ چل پڑی ہے کے نام سے یکجا صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا ناول " جاگے ہیں خواب میں" تھا۔ یہ ناول اسلام آباد کے عقب میں واقع مارگلہ کے پہاڑی سلسلے کے دوسری طرف بہنے والے دریائے ہرو کے آس پاس رہنے والوں کی زندگیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول کے لیے انہوں نے اپنے دوست وصی حیدر کی مدد سے 1001 پینٹنگز کے کور بنوا کر، جو ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں، ایک ورلڈ ریکارڈ قائم کیا۔

2017ء میں انہوں نے ایک اور ناول "جندر" لکھا۔ شعور کی رو میں لکھا گیا یہ ناول، خیالات کا ایک دائرہ مکمل کر کے اپنے نقطۂ آغاز پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار ولی خان بستر مرگ پر لیٹا، موت کا منتظر ہے، خیالات کی رو میں بہتا ہوا وہ بار بار دور جاتا اور ایک خاص مقام پر ٹھہرے ہوئے وقت کے سنگ ہائے میل ناپتا ہے اور واپس اسی نقطے پر

بار بار واپس آتے ہوئے اپنی کہانی مکمل کرتا ہے۔ اس انتخاب میں ان کے ناول "جندر" سے چند صفحات شامل کیے گئے ہیں۔

ناول "جندر" واحد متکلم کی آپ بیتی ہے جو بستر مرگ پر ماضی میں پیچھے جا کر اپنی پوری کہانی سنا رہا ہے۔ ایک ایسا بچہ جس نے ماں کو نہیں دیکھا، کہ وہ اس کی پیدائش کے فوراً بعد ہی مر گئی تھی، مگر اس نے ماں کو جس طرح محسوس کیا، اس نے اس کی بقیہ زندگی کی شکل ڈھالی۔ ماں کی کوکھ میں سنی "جندر" (یا ایک بڑی پن چکی) کی آواز جو اس کے ذہن پر، اس کی خوشبو اور آواز کی طرح یوں ثبت تھی کہ اس نے ماں کی گود، لوری، لمس اور خوشبو کی جگہ لے لی تھی۔

اختر رضا سلیمی کی کہانی کا ماحول، کردار اور مناظر جیتے جاگتے انسان ہیں اور کسی تجرباتی واردات کا احساس دلاتے ہیں۔ کرداروں کی تحلیلِ نفسی کی تکنیک کو نظر میں رکھا جائے تو اس سے مصنف کی نفسیات کے بارے میں گہری تجزیاتی فکر کا پتا چلتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس فکری سفر کے دوران ناول کا مرکزی کردار اپنے علاوہ اپنے باپ اور اپنی بیوی کی بھی تحلیلِ نفسی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور محض واقعات سے نہیں بلکہ اپنے تجزیے سے بھی ان کرداروں کی سوچ کی تصویر کشی کرتا ہے۔

جندر

سال اشاعت: 2017

اختر رضا سلیمی

میرا یہاں اس طرح مرنا صرف ایک انسان کی نہیں، ایک تہذیب کی موت ہے۔
وہ تہذیب جس کی بنیاد انسان نے ہزاروں سال پہلے اس وقت رکھی تھی جب دنیا کے پہلے انسان نے بہتے پانی کی قوت کا اندازہ لگایا تھا۔ جس طرح حضرت نوحؑ کا پیش رو، جس نے سب سے پہلے ہوا کی طاقت کا اندازہ لگا کر دنیا کی پہلی بادبانی کشتی تیار کی تھی، یقیناً کسی ساحلی علاقے کا باسی تھا، اسی طرح پانی کی طاقت کا اندازہ لگانے والا پہلا شخص میری طرح کوئی پہاڑی ہی رہا ہوگا جو مال مویشی چرانے کسی جنگلی چراگاہ میں جاتا رہا ہوگا جہاں کسی پہاڑی آبشار سے پانی پیتے ہوئے اس پر پانی کی قوت کا راز منکشف ہوا ہوگا۔ جوں ہی اس نے پانی پینے کے لئے اوک پانی کی دھار کے نیچے رکھی ہوگی اور پانی نے اسے زور سے دھکیلا ہوگا اس پر پانی کی قوت کا راز منکشف ہو گیا ہوگا۔ وہ کئی دن تک اس بارے غور و فکر کرتا رہا ہوگا اور پھر اس نے اسی آبشار کے کنارے موجود جنگلی انار کے درخت سے انار توڑ کر اسکے پیٹ میں انار ہی کے آٹھ دس موٹے کانٹے گھسیڑ کر اور ایک پتلی لکڑی اس کے آر پار کر کے اسے ایک دوسری لکڑی میں یوں پیوست کر لیا ہوگا کہ حرکت دینے پر وہ گھوم سکے۔ یوں ایک کھلونا بنا کر وہ ایک عرصے تک اس سے کھیلتا رہا ہوگا۔
ایک دن جب اس کی ماں یا بیوی جس کے ذمے دانے پیسنے کی ذمہ داری رہی ہوگی، بیمار پڑی ہوگی اور اسے خود ہتھ چکی چلانا پڑی ہوگی تو چکی چلاتے ہوئے جب اسے پورا زور لگانا پڑ رہا ہوگا تو اس کے ذہن میں ایک ایسی چکی کا تصور ابھرا ہوگا جسے چلانے کے لئے انسانی ہاتھوں

کی قوت درکار نہ ہو۔ اس معاملے پر سوچتے سوچتے معاً اس کھلونا بندر کا خیال آیا ہوگا جس سے وہ ایک عرصے تک کھیلتا رہا ہوگا۔

اس نے اس منصوبے پر عمل درآمد کے لئے اپنے خاندان یا قبیلے کے سیانوں سے مشورہ کیا ہوگا جسے سب نے مسترد کر دیا ہوگا کہ ان کا ذہن کسی ایسی حرکت کا تصور ہی نہیں کر سکتا ہوگا جو کسی انسان یا جانور کی طاقت کے بغیر عمل میں لائی جا سکے۔ لیکن وہ میری بیوی کی طرح اپنی ہٹ کا پکا ہوا ہوگا اور اس نے تنہا ہی اپنی کوششیں جاری رکھنے کا عزم کیا ہوگا۔ ممکن ہے ایک آدھ آدمی کو اس نے اپنا ہم نوا بھی بنا لیا ہو جس نے اس منصوبے کی تکمیل میں اسے مدد دی ہو۔

وہ کئی دن تک کسی آبشار کے کنارے بیٹھا اپنے ذہن میں اسے منصوبے کا خاکہ تیار کرتا رہا ہوگا۔ پھر اس نے اپنے ذہن میں موجود بندر کے اس نقشے کو پتھر ہی کے قلم سے ایک سلیٹ نما پتھر پر اتارا ہوگا پھر اسی آبشار کے کنارے کھڑے کسی درخت کو کاٹ کر اس کے موٹے تنے سے فٹ بھر ٹکڑا علیحدہ کر کے اسے یوں تراشا ہوگا کہ وہ دور سے دیکھنے پر ایک بڑا اناری نظر آئے، باقی تنے سے اس نے دو دو جن کے قریب ہتھیلی بھر چوڑی لکڑی کی پھٹیاں تراشی ہوں گی اور اناری نما تنے میں تھوڑے تھوڑے ترچھے سوراخ کر کے انہیں اس میں ٹھونک دیا ہوگا ،پھر اس نے اسی درخت کی کسی سیدھی شاخ سے ایک مضبوط دستہ تراش کر اسے اس کے اوپر والے سرے میں ٹھونک دیا ہوگا یوں ویسا ہی یا اس سے ملتا جلتا ایک چرخا تیار ہو گیا ہوگا جیسا اس وقت میرے اس بندر کے پیچھے گھوم رہا ہے۔

اگلے مرحلے میں اس نے پتھر کے دو ویسے ہی پاٹ تراشے ہوں گے جیسے اس کے گھر میں پہلے سے موجود ہوں گے۔ پھر اس نے ایک ایسی جگہ کو منتخب کیا ہوگا جہاں سے وہ ندی کا پانی موڑ کر ایک خاص بلندی پر سے لکڑی کے ایک عمودی پرنالے کے ذریعے گرا سکے۔ اس

پرنالے کے آگے جہاں پانی گر رہا ہوگا، اس نے لکڑی کا ایک بھاری تختہ، جس کے وسط میں اس
نے پہلے ہی سوراخ کر رکھا ہوگا، بچھایا ہوگا اور پھر اس سوراخ میں چرخے کا نیچے والا سرا یوں
پیوست کیا ہوگا کہ جب پانی اس کے گرد لگی لکڑی کی پھٹیوں کو دھکیلے تو وہ آسانی سے اپنے
محور پر گھوم سکے۔ اس چرخے کے عین اوپر کمرے کے فرش پر اس نے پتھر کے تراشے گئے دو
پاٹوں میں سے ایک زمین میں نصب کیا ہوگا اور چرخے کے دستے کا اوپر والا سرا اس کے سوراخ
میں سے گزار کر اس کے اوپر لکڑی یا دھات (اگر اسے لوہا دستیاب تھا) کی ایک فی نصب کی ہوگی
اور پھر اس کے ناپ کے مطابق اوپر والے پاٹ کو چھینی سے کھرچ کر اس میں یوں فٹ کر دی
ہوگی کہ جب چرخا گھومے تو اوپر والا پاٹ بھی اس کے ساتھ گھومنے لگے۔

اس کام کی تکمیل کے بعد اس نے پتھر کا ایک بڑا کھرا تراشا ہوگا اور پاٹوں کے پیچھے
ایک اونچا تھلا بنا کر اسے اس کے اوپر نصب کر دیا ہوگا پھر اس کے وسط میں سوراخ کر کے لکڑی
کی نالی کے ذریعے اسے ان پاٹوں کے وسط میں بنائے گئے سوراخ سے یوں ملا دیا ہوگا کہ اگر
کھارے میں دانے انڈیلے جائیں تو وہ آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے پاٹوں کے درمیان گرنے
لگیں۔ یہ سب کر چکنے کے بعد جب اس نے پانی موڑ کر پرنالے کے ذریعے جندر میں گرایا ہوگا
اور وہ پہلی دفعہ جندر کی کوک سے آشنا ہوئی ہوگی تو جندر روئی تہذیب کا آغاز ہوا ہوگا۔ جندر
نے ہزاروں سال انسان کا ساتھ دیا اور اس کی تمدنی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ پانی سے
بجلی پیدا کرنے کا خیال بھی انسان کو یقیناً جندر ہی نے بخشا۔ مجھے تو یقین ہے کہ پن بجلی کا پہلا
تجربہ کرنے والا سائنس دان یا تو کسی جندر روئی کا بیٹا تھا یا اس کا کوئی رشتہ دار۔ ہزاروں سال تک
انسان کا ساتھ نبھانے والی جندر روئی تہذیب اب آہستہ آہستہ اپنے انجام کو پہنچ رہی ہے اور
میرے اور میرے اس جندر کی تباہی کے بعد اس میں مزید تیزی آجائے گی۔ کچھ علاقوں میں

جو جندر ابھی چل رہے ہیں، وہ بھی اگلے کچھ سالوں میں کھنڈر ہو جائیں گے کہ جندر ہی کی کوکھ سے پیدا ہونے والی پن بجلی سے چلنے والی چکیاں اب ہر گاؤں میں نصب ہونے لگی ہیں۔

میری عمر اس وقت تقریباً اتنی ہی ہے جتنی میری پیدائش کے وقت بابا جمال دین کی تھی۔ میں شاید بابا جمال دین جتنا تو نہ جی سکتا لیکن اس کے باوجود میں دس برس تو مزید گزار ہی لیتا، اگر میرے جندر کو اس کا دانہ پانی ملتا رہتا اور اس کی سریلی گونج برقرار رہتی۔

سات سال پہلے جب میرا اپنا راحیل گاؤں کی مسجد کے خادم کو بجلی سے چلنے والی آٹا مشین لگانے کے لئے مالی معاونت فراہم کر رہا تھا تو اس کے سان گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ وہ ایک تہذیب کے انہدام میں حصہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کی موت کا سامان کر رہا ہے ۔وہ تو اس بات سے بھی بالکل بے خبر ہے اور میری موت کے بعد ہمیشہ بے خبر ہی رہے گا کہ اس کی ماں نے، شادی سے پہلے اپنے ذہن میں میری شخصیت کا جو تصور قائم کر رکھا تھا شادی کے بعد میں اس سے سراسر مختلف نکلا۔ اس نے مجھے ایک بہادر، آزاد اور دنیا سے بے نیاز آدمی سمجھ کر مجھ سے شادی کی تھی اور پھر جیسے ہی اسے پتا چلا کہ میں انتہا بزدل اور مجبور آدمی ہوں کہ جندر کی سریلی گونج کے بغیر سو بھی نہیں سکتا تو اس نے پہلے جذباتی اور پھر ایک ناقابل توضیح اور مبہم انداز میں مجھ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ میرے رشتہ داروں سمیت تمام گاؤں والے اس بات پر حیران تھے اور حیران نہ ہونے کی ان کے پاس کوئی وجہ بھی نہیں تھی کہ ایک ایسا رشتہ جسے اس نے اپنی مرضی، بلکہ اپنے والدین خاص کر والد سے ضد کر کے استوار کیا تھا، اتنی آسانی سے کیوں اور کیسے توڑ لیا اور وہ بھی سال سوا سال کے مختصر عرصے میں بغیر کسی وجہ کے۔ گاؤں والے تو کیا کہ اس کے والدین اور بھائی بھی کبھی اس کی وجہ نہیں جان سکے۔

میں ایک عرصے تک یہی سمجھتا رہا کہ اس نے بعد میں راحیل کو ہماری علیحدگی کی وجوہات سے آگاہ کر دیا ہو گا۔ آخر شعور کی عمر میں قدم رکھنے کے بعد اس نے کبھی تو یہ سوال اٹھایا ہی ہو گا کہ

طلاق نہ ہونے کے باوجود آپ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ کیوں رہ رہے ہیں۔ لیکن بہت عرصے بعد مجھ پر کھلا کہ اس نے یہ راز ہمیشہ کے لئے اپنے سینے میں دفن کر دیا تھا اور اس کی وجہ اس کا میرے بارے میں کہا ہوا وہ جملہ ہوگا جو ہماری شادی سے پہلے زبان زد خاص و عام تھا کہ مرد ہو تو ولی خان جیسا! بہادر، آزاد اور بے نیاز۔

میری طرف سے اس انکشاف کے بعد کہ میری زندگی جندر کے پاٹوں کی سریلی گونج سے بندھی ہوئی ہے۔ اس کے ارمانوں کا خون ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں میری شخصیت کے بارے میں موجود تصور کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ وہ ایک مثالیت پسند خاتون تھی۔ اس نے مجھ سے نہیں اس تصور سے شادی کی تھی جو میرے بارے میں اس نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا تھا اور اس تصور کے ٹوٹنے کے بعد میرے ساتھ اس کا رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ پھر جب میں نے اسے گھر واپس لانے کے لئے جندر چھوڑ کر لکڑی کا ٹال لگایا تھا تو اس نے اس امید کے ساتھ واپس میرے گھر میں قدم رکھا تھا کہ شاید میں خود کو اس کے تصور کے مطابق ڈھال سکوں لیکن میں کوشش کے باوجود اس میں ناکام رہا۔ اگر اس دوران میں ہمارا اٹیل پیدا نہ ہوتا تو شاید میں اپنی کوششیں جاری رکھتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ میں اس میں کامیاب بھی ہو جاتا جیسا کہ اس کا خیال تھا جس کا اظہار، مجھے حوصلہ دینے کے انداز میں وہ کئی بار کر چکی تھی۔ وہ اٹیل ہی تھا جس کی پیدائش نے میرے دماغ میں یہ بات انڈیلی کہ اب اس کے قدموں میں بھی ایک بچے کی بیڑی ڈل چکی ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ کسی بیڑی کو خاطر میں نہیں لائے گی! اس وقت بھی جب میں اپنے بدن کو اس کا لباس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بدن کی ایک رات کی یخ بستگی نے ہمارے درمیان سرد مہری کی ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی، جسے گرانے میں، میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔

میں اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جب راحیل اس سے ہماری علیحدگی کی
وجہ دریافت کرتا رہا ہوگا تو وہ اسے کیا جواب دیتی رہی ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس نے کسی
بھی موقع پر اسے میرے خلاف نہیں اکسایا ہوگا کہ میٹرک کرنے تک وہ میرے پاس بندر پہ
ہر دوسرے تیسرے روز آتا جاتا رہا۔ ان دنوں وہ جوان ہو چکا تھا لیکن اس نے میرے سامنے یہ
سوال کبھی نہیں اٹھایا۔ بعد میں وہ مزید تعلیم حاصل کرنے شہر چلا گیا اور اس دوران میں بھی وہ
جب بھی گاؤں آتا مجھے ملنے ضرور آتا۔ میں نے اس کے مزاج میں تبدیلی افسر بن جانے کے بعد
محسوس کی اور پھر شادی کے بعد اس کا میرے ساتھ رویہ یک دم تبدیل ہو گیا تھا۔

میں نے جو کچھ کہانیوں سے سیکھا، اس کی بنیاد پر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ہماری
علیحدگی کے سلسلے میں، شروع ہی سے مجھے ہی قصوروار سمجھتا رہا ہوگا اور پھر لاشعوری طور پر مجھ
سے نفرت کرنے لگا ہوگا۔ یہ نفرت اس رقابت سے سراسر مختلف رہی ہوگی جسے فرائیڈ نے
ایڈی پس کمپلیکس کا نام دیا تھا۔ وہ تو اس بات کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکا ہوگا کہ اس کی ماں نے
مجھ سے محض اس لئے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ مجھے بندر کی گونج سے علیحدہ نہیں آتی۔ اگر
ہم دونوں میں سے کوئی اس کے لڑکپن ہی میں اسے علیحدگی کی وجہ بتا دیتا تو آج وہ یقیناً ایک
مختلف شخص ہوتا اور نہیں تو کم از کم میری شخصیت کے بارے میں اس کا تصور لازماً مختلف ہوتا
اور اس کے دل میں میرے خلاف نفرت کے بجائے ترحم کے جذبات ابھرتے۔ بے شک
افسر بننے کے بعد اسے یہ گوارا نہ ہوتا کہ اس کا باپ بندر پر بیٹھ کر اس کی رسوائی کا سامان کرے
لیکن اس کا رویہ ویسا نہ ہوتا جیسا کہ ہے۔ اگر اس کی بیوی اصرار کرتی تو وہ یہ کہہ کر اس کا منہ
بند کرا دیتا کہ میرے باپ کی زندگی اسی بندر سے جڑی ہوئی ہے اب میں اسے مار تو نہیں سکتا۔

اپنی نوجوانی کے دنوں میں جب وہ میرے ہاں آتا اور مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کیا
کرتا تھا تو کئی دفعہ میں نے سوچا کہ اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کر کے اپنا دامن صاف کر لوں

لیکن میں پھر یہ سوچ کر اپنے ارادے سے باز رہا کہ ممکن ہے وہ اپنی ماں کے بارے میں بد گمان ہو جائے اور یوں میں اس خاموش مفاہمت کی خلاف ورزی کر بیٹھوں جو علیحدگی کے پہلے ہی دن سے ہمارے درمیان جاری تھی۔

مجھے یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کو قصور وار ٹھہرائے اسے اب تک اسی نے پالا پوسا اور لکھایا پڑھایا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اس کی پرورش مجھ سے بہتر طور پر کر رہی ہے اگر وہ میرے ساتھ رہتا تو میں اسے کبھی اتنی توجہ نہ دے سکتا اور آج وہ اتنا بڑا افسر کبھی نہ بن سکتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب سلیکشن کے بعد وہ مجھے ملنے آیا تھا تو اس نے یہیں اسی تھڑے پر بیٹھ کر کہا تھا کہ مجھے شہر میں ایک بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے اب آپ کو جندر پر بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ یا تو اسے بار دیں یا پھر کسی اور کے حوالے کر کے گھر میں آرام کریں۔ میں خاموش رہا تھا ظاہر ہے میں جندر چھوڑ تو نہیں سکتا تھا لیکن اپنے بیٹے کے منہ سے یہ سب سن کر خوش ضرور ہوا تھا۔

کچھ ماہ بعد جب وہ دوبارہ مجھے ملنے آیا تو اس کے رویے میں خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ اب کی بار اس کے لہجے میں ایک افسر بول رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ خدارا میری عزت کا خیال کریں۔ اب یہ سب چھوڑیں اور گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کریں۔ مجھے اس کے اس رویے سے بہت صدمہ پہنچا تھا اور وہ خوشی جو پچھلی ملاقات میں اس کی باتوں سے مجھے ملی تھی، زائل ہو گئی تھی۔

اس کے بعد وہ جب بھی مجھے ملنے آیا اس کا رویہ یہی تھا۔ وہ باتوں باتوں میں مجھ پر واضح کر دیتا کہ اسے میرا اس طرح جندر سے چپکے رہنا ہرگز گوارا نہیں۔ اس کے رویے میں مزید تبدیلی شادی کے فوراً بعد دیکھنے میں آئی۔ کئی دفعہ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ مجھے زبردستی یہاں سے اٹھا کر ساتھ لے جاتا لیکن ایسی صورت میں وہ گاؤں والوں

کو کیا مت دکھایا۔ چناں چہ اس نے گاؤں کی مسجد کے خادم کو بجلی سے چلنے والی آٹا مشین لگا کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ اسے معلوم تھا کہ ارد گرد کے دیہات میں پہلے سے آٹا مشینیں چل رہی ہیں اور صرف ہمارے ہی گاؤں کے لوگ اب ابا کے جندر پر آٹا پسوانے جاتے ہیں۔ جب ان لوگوں کو یہ سہولت گاؤں ہی میں دستیاب ہو جائے گی تو کوئی ادھر کا رخ نہیں کرے گا یوں اس کے باپ کے پاس جندر ہارنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔

مسجد کا خادم، جو ایک حد تک اس کا بھی خادم تھا کہ گاؤں میں موجود اس کے گھر بار کی دیکھ بھال بھی اسی کے ذمے تھی، ایک غریب آدمی تھا، جس کا بیٹا شہر میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرتا تھا۔ راحیل نے اسے اعتماد میں لے کر بجلی پر اٹھنے والے اخراجات اس کے بیٹے کے حوالے کئے تاکہ کسی کو شک نہ گزرے کہ اس کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے۔ چند ہی دنوں میں وہ شہر سے بجلی سے چلنے والی آٹا چکی لے آیا اور جامع مسجد کی کرائے پر اٹھائی جانے والی دوکانوں میں سے ایک دکان جو پچھلے کچھ عرصے سے مسجد کے اضافی سامان کے لئے ایک طرح کے سٹور کا کام دے رہی تھی کرائے پر لے کر اس میں نصب کر لی۔

جامع مسجد گاؤں کے عین وسط میں واقع ہے اور اسکے چاروں محلے اس کے چو گرد پھیلے ہوئے ہیں چوں کہ گاؤں کا مرکزی بازار بھی وہیں ہے اور لوگ سودا سلف لینے بھی وہیں جاتے ہیں، اس لئے چکی کی تنصیب کے لئے اس جگہ کا انتخاب کرتے ہوئے میرے بیٹے کے پیش نظر یہ بات ضرور رہی ہو گی کہ ایسی صورت میں انہیں آٹا پسوانے کے لئے بطور خاص کہیں اور نہیں جانا پڑے گا۔ جب بھی کوئی آدمی بازار میں سودا سلف خریدنے نکلا کرے گا، جاتے ہوئے ایک چو تھک بھی کاندھے پر رکھ کر لے جایا کرے گا جب کہ میرے جندر پر آٹا پسوانے انہیں بطور خاص آنا پڑتا تھا اور وہ بھی اتنی دور ایک دشوار گزار ڈھلوانی راستہ اتر کر۔ واپسی پر تو انہیں آٹا اٹھا کر میل بھر چڑھائی بھی چڑھنا پڑتی تھی اور بیشتر لوگوں کا سانس پھول

جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی پہلے پہل بہت سے لوگوں نے میرے جندر سے رشتہ نہیں توڑا۔

ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جو مروتاً میرے پاس آٹا پسوانے آتے تھے اور پرانی لاج نبھاتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ مشین سے پسوائے گئے آٹے میں سواد نہیں ہوتا؛ خاص کر بوڑھے بزرگ جو مجھ سے بڑے یا میرے ہم عمر تھے انھیں تو مشین سے پسوائے گئے آٹے کی روٹی کا بالکل ہی سواد نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چار پانچ سال تک تو اتنے دانے میرے جندر پر بھی آہی جاتے تھے کہ کم از کم رات بھر جندر کی سریلی گونج ندی کے شور کرتے پانی پر تیرتی رہتی اور مجھ سمیت یہاں کی ہر چیز خوشی سے جھومتی رہتی، پھر آہستہ آہستہ ان میں کمی آتی گئی اور میں نے بھی معمول بنا لیا کہ صرف سوتے وقت انھیں کھارے میں انڈیلتا تاکہ جندر گونجتا رہے اور تین چار گھنٹے میری آنکھ لگی رہے۔ پھر جیسے ہی دانے ختم ہوتے اور جندر کی خوشگوار آواز ایک ہوک میں تبدیل ہوتی میں جاگ جاتا۔ اگر دوسری چونگ موجود ہوتی تو اسے کھارے میں انڈیل دیتا اور دوبارہ سو جاتا نہیں، اسی نیند کو غنیمت سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرتا۔ لیکن جیسے جیسے چونگیں آنا کم ہوتی گئیں، میری نیند بھی کم ہوتی گئی، اس دوران میں کبھی کبھار ایک دو دنوں کا وقفہ بھی آجاتا اور ہر بار ایسا بھی ہوا کہ میں مسلسل ستر بہتر گھنٹے تک بھی جاگتا رہا لیکن پھر جیسے ہی کوئی چونگ اٹھائے جندر کا رخ کرتا، میں انھیں کھارے میں انڈیل کر بھاگتا ہوا جندر کے پچھواڑے جاتا اور آدھا پانی موڑ کر جندر کو ہلکی رفتار سے چلا کر یہیں تختے پر سو جاتا۔ لیکن اب گذشتہ پینتالیس دنوں سے تو میں تقریباً جاگ ہی رہا ہوں کہ کسی نے بھی ادھر کا رخ نہیں کیا شاید اب بوڑھے بھی مشینی آٹے کی روٹی کے عادی ہو چکے ہیں۔

میری معدوم ہوتی یادداشت میں پینتالیس دن پہلے کا وہ لمحہ اب بھی پوری طرح نقش ہے، جب چونگ چین کر جندر کی کیل اٹھاتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا تھا کہ میں اپنی اور جندر کی زندگی کی آخری چونگ چین چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جب قیامت کے دن مجھے اٹھایا جائے گا تو میری یادداشت میں سب سے پہلے یہی منظر ابھرے گا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم جب کسی فوت شدہ عزیز کا چہرہ دیکھتے ہیں تو وہ ہمارے ذہن پر یوں نقش ہو جاتا ہے کہ اس سے متعلق باقی یادوں کو تقریباً مٹا کر رکھ دیتا ہے حالاں کہ ہم نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اس کے ساتھ بسر کر رکھا ہوتا ہے اور اس سے وابستہ بے شمار یادیں ہمارے شعور اور لاشعور میں موجود ہوتی ہیں لیکن جوں ہی ہم اس کے بارے میں سوچتے ہیں، ہماری یادداشت میں سب سے پہلے اس کا مردہ چہرہ ہی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ میں نے جب بھی اپنے باپ یا ماں جان کے بارے میں سوچا جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز تھے، ان کا مردہ چہرہ ہی میری یادداشت میں ابھرا۔ اس کے برعکس بے شمار ایسے لوگ جو مر کھپ چکے ہیں، جن میں میری مرحومہ بیوی بھی شامل ہے اور میں کسی وجہ سے ان کی موت کے موقع پر ان کا آخری دیدار نہیں کر سکا؛ آج بھی جب مجھے یاد آتے ہیں تو ان کا زندہ چہرہ ہی میرے سامنے آتا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے بہت پہلے ہی ہو گیا تھا یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مجبوری لاحق نہ ہوتی تو میں عموماً اپنے مرے ہوئے عزیزوں کا آخری دیدار نہیں کرتا تھا یوں اپنی یادداشت میں ان کا زندہ چہرہ ہی محفوظ کر لیتا تھا۔ لیکن جندر کے معاملے میں، میں ایسا نہیں کر سکا۔ اس کی وہ سریلی گونج، جس کا میں ساری زندگی اسیر رہا، اب کافی غور کرنے کے بعد مجھے یاد آتی ہے۔ جوں ہی میرا دھیان اس کی طرف جاتا ہے مجھے وہی منظر یاد آتا ہے جب میں

نے آخری چوٹک چھیں کر جندر کی کیل اٹھائی تھی اور اس کی سریلی گونج یک دم درد بھری
کوک میں تبدیل ہو گئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس خیال کے آتے ہی میں نے پیچھے مڑ کر ایک نظر
دروازے کے اس پار سامنے والی پہاڑی پر ڈالی تھی جہاں ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنوں نے
پیلاہٹ پھیلا رکھی تھی اور مجھے یوں لگا تھا جیسے سورج کوہ ل کے پہاڑوں کے پیچھے نہیں
میرے دل میں ڈوب رہا ہے۔ جوں جوں سورج ڈوبتا جا رہا تھا اور شام کے سائے گہرے
ہو رہے تھے، مجھے اپنا وجود پھیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب سورج کی آخری کرنیں پہاڑی کی
چوٹی پر موجود کاہو کے سب سے بلند و بالا درخت کی آخری پھنگوں پر سے آہستہ آہستہ غائب
ہو رہی تھیں، مجھے لگا جیسے سورج میرے دل کے کسی نہاں خانے میں گم ہونے کو ہے اور
میرے وجود کا سایہ کائنات کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اگلے کچھ ہی لمحوں میں
ساری کائنات میرے وجود کے اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔ میں ساری رات جندر کے رکے
ہوئے پاٹ کے سامنے تھلے پر بیٹھا اپنے وجود کی گہرائیوں میں گم ہو چکی کائنات کو ٹٹولتا رہا تھا۔

اگلی صبح سورج مشرقی پہاڑی کی چوٹی سے نہیں میرے معدوم ہوتے وجود کی
گہرائیوں سے ابھرا تھا۔ جوں ہی کائنات پر سے میرے وجود کا سایہ چھٹا میں اٹھا اور جندر کے
پچھواڑے جا کر لکڑی کا پھٹہ جو پرنالے کے اوپر والے سرے میں پیوست تھا، کھینچ کر نکالا اور
دوسری طرف والی نالی میں گھسیڑ دیا۔ جوں ہی پانی کی دھار نے چرخے کو چھوا جندر کی ہوک
مجھے پانی کے شور میں بھی سنائی دینے لگی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا واپس آیا اور جوں ہی
جندر کی دہلیز پر قدم رکھا مجھے لگا جیسے یہ درد بھری ہوک میرے اندر سے ابھر رہی ہے۔ مجھے
ایک درد بھری سرشاری ہوئی ویسی ہی سرشاری جیسی خود اذیتی کے شکار لوگوں کو ہوتی ہے
لیکن میں اس خود اذیتی سے زیادہ دیر لطف اندوز نہ ہو سکا۔ جلد ہی مجھے جندر کے پچھواڑے جا

کر پانی موڑ دیا۔ اوپر والے پاٹ کے ساتھ لکڑی کی وہ کیل، جسے کھینچنے سے اوپر والا پاٹ اپنے
معمول سے تھوڑا سا اوپر اٹھ کر نچلے پاٹ سے رگڑ کھائے بغیر گھومتا رہتا ہے، یک دم ٹوٹ گئی
اور دونوں پاٹوں کی آپس میں رگڑ کی وجہ سے کمرے میں اتنی گرد اور بو پھیل گئی کہ وہاں ٹکنا
محال ہو گیا۔ اس روز میں ساری رات کوئی ایسی صورت نکالنے کے منصوبے بناتا رہا کہ جندر
کے دونوں پاٹ آپس میں رگڑ کھائے بغیر مستقل گھومتے رہیں۔

صبح اٹھ کر میں نے کوہل کے دامن میں واقع اس گاؤں کی راہ لی جس کے ایک کچے
گھر میں کسی دور میں چاچا جان محمد اور اب اس کا بیٹا فضل رہتا تھا۔ فضل اپنے باپ کی طرح جندر کا
ماہر کاری گر تھا اور جن دنوں آٹا پیسنے کا واحد ذریعہ جندر ہی تھے، جندروئیوں میں اپنے کام کی
وجہ سے بہت مقبول تھا۔ علاقے میں چلنے والے جندروں میں سے جب بھی کوئی جندر خراب
ہوتا اسے ٹھیک کرنے کے لئے اسی کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ وہ جندر کے ہر حصے کے کل
پرزوں کا کام جانتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی پتا تھا کہ ندی جوڑیاں یا ندی نیزاں کے کس حصے
میں، کس موسم میں کتنا پانی ہوتا ہے اور اس کے لئے کتنے ہلکے یا بھاری پاٹ سے کام چلایا جا سکتا
ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے ایک آدھ سال ہی بڑا ہے اور میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب
میرے بچپن میں وہ اپنے باپ کے ساتھ ہمارا جندر ٹھیک کرنے آیا کرتا تھا۔ اپنی نوجوانی کے
دنوں میں جب میں نے جندر کے ساتھ کتابوں کے لئے الگ سے کمرہ بنانے کا پروگرام بنایا تھا تو
اس کی پیمائش کرنے وہی آیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی کام میں گزارا لیکن بعد میں
جب آس پاس کے دیہات میں بجلی سے چلنے والی چکیاں نصب ہونے لگیں اور جندروں کا کام
ٹھپ ہونے لگا تو اس کا کام دھندا بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ وہ آخری بار سولہ سترہ سال پہلے میرا
جندر ٹھیک کرنے آیا تھا چونکہ جندر کے چھوٹے موٹے کام میں خود بھی کر سکتا ہوں اس لئے
اس کے بعد اول تو مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور اگر پڑی بھی تو یہ سوچ کر کہ اب

وہ اس پیشے کو ترک کر چکا ہے اور معلوم نہیں اس کے پاس ضروری اوزار ہیں بھی یا نہیں میں نے اسے کبھی زحمت نہیں دی لیکن اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ برسوں بعد میں نے جب اس کے گھر میں قدم رکھا تو مجھے لگا جیسے گزرتے وقت کا ہر ہر لمحہ اس کے چہرے پر جھریوں کی صورت میں نقش ہے البتہ اس کا مکان اب بھی ویسا ہی تھا جیسا میں نے پندرہ سولہ سال پہلے دیکھا تھا خستہ اور خراب حال۔ اس کی نظر بہت کمزور ہو چکی تھی جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے "ولی خان تم" کا آوازہ بلند کیا اور خوشی کے مارے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ جب اس نے آنے کی وجہ دریافت کی اور میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو کچھ دیر وہ بھونچکا سا ہو کر یوں میرا منہ دیکھتا رہا جیسے اس پر میرا پاگل پن آشکار ہو چکا ہو۔ اگرچہ اس نے مروت میں آ کر اس کا اظہار نہیں کیا مگر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ایسا ہی سمجھ رہا ہے۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ میں پاگل نہیں ہوں، بس میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے جندر کی گونج سنے بغیر نیند نہیں آتی وہ میرے ساتھ چل پڑا مگر میں نے دیکھا کہ وہ کچھ خوف زدہ سا ہے۔ اس کا خوف دور کرنے کے لئے میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ اسے وہ دن یاد دلائے جب وہ میرے جندر پر آیا کرتا تھا اور ہم دونوں دیر تک خوش گپیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ میں نے اسے اس کے سنائے ہوئے لطیفے بھی یاد دلائے تا کہ اس کا شک دور ہو جائے۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں راستے ہی سے نہ کھسک جائے اور میرا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے۔

جندر پر پہنچتے ہی اس نے اپنا کام شروع کر دیا اور سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے اس نے اوپر والے پاٹ کا مستقل طور پر ایسا بندوبست کر دیا کہ اوپر والا پاٹ نچلے پاٹ سے رگڑ کھائے بغیر ہی گھومتا رہے۔ میں نے جب اسے مزدوری دینے کی کوشش کی تو اس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ اب پندرہ سال سے میرا اس کے بغیر بھی گزارہ چل رہا ہے۔ اب مجھے مانگ

کر کھانے میں عار محسوس نہیں ہوتی اور تم ابھی اس کے عادی نہیں ہوئے۔ خالی پیٹ بھی نیند نہیں آتی۔ سو میری طرف سے رکھ لو، ممکن ہے کبھی تمھارے کام آ جائیں۔ میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا اور آبدیدہ آنکھوں سے اسے رخصت کیا۔ یوں چندر ایک مرتبہ پھر کوکنے لگا اور اس کی کوک مجھے اپنے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی کوک کی طرح محسوس ہونے لگی اور یوں میں ایک طرح کی خود اذیتی کا شکار ہوتا چلا گیا جس نے رفتہ رفتہ مجھے نڈھال کرنا شروع کر دیا۔

اور اب یہ حال ہے کہ مسلسل بے خوابی کی وجہ سے میری بھوک مکمل طور پر مٹ چکی ہے اور گزشتہ تین دن سے میں نے حلق سے ایک نوالہ بھی نہیں اتارا۔ صرف پانی پر گزارا چل رہا ہے میرا بھی اور چندر کا بھی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر کہیں سے کوئی چوگ میسر آ جائے اور میں چندر کی وہی سریلی گونج دوبارہ سن سکوں تو میرا ماس، جو گزشتہ سینتالیس دنوں میں خالی گھومتے چندر کی کوک نے میری ہڈیوں سے علیحدہ کر دیا ہے دوبارہ ہڈیوں سے جڑنا شروع ہو جائے گا میری کھوئی ہوئی طاقت بحال ہونا شروع ہو جائے گی اور میں دوبارہ وہی اٹھنے لگوں گا لیکن اب اس قسم کی کوئی امید بے کار ہے کہ اگر گاؤں میں گل مشتی بچی ابھی اور اسی لمحے بھٹک سے اڑ جائے تو بھی رات کے اس آخری پہر میں کوئی یہاں آنے سے رہا اور ابھی کچھ دیر بعد جب یہ پہنچے گی تو پانی سر سے گزر چکا ہو گا۔

ارشد وحید-(1960-)

ارشد وحید نے نشتر میڈیکل کالج، ملتان سے ایم بی بی ایس کیا۔ اس کے بعد "ترقی پذیر ملکوں میں سوشل پالیسی اور منصوبہ بندی" کے موضوع پر لندن کے اسکول آف اکنامکس سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے علاوہ "صحت اور انسانی حقوق" کے موضوع پر سویڈن سے ایک سالہ سرٹیفکیٹ کورس کیا۔ وہ گذشتہ بیس برسوں سے اس شعبے میں سرگرم عمل ہیں اور پاکستان سمیت افغانستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور تھائی لینڈ میں خدمات انجام دے چکے ہیں۔

ادب سے ان کا تعلق بطور ناول نگار، افسانہ نگار، مترجم اور کالم نگار ہے۔ ان کے متعدد تراجم شائع ہو چکے ہیں، جن میں میلان کنڈیرا کی مشہور کتاب "ناول کا فن"، اس کا شہرہ آفاق ناول "لازوالیت" اور گابریئل گارسیا مارکیز کا دل موہ لینے والا ناول "وبا کے دنوں میں محبت" شامل ہے۔ بعض سماجی موضوعات پر بھی ان کی کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انگریزی میں ان کے افسانوں کا مجموعہ جلد چھپنے والا ہے۔

ان کا پہلا ناول "گمان" ہے، جس کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور وہ رواں برس یا اگلے سال تک چھپ جائے گا۔ انگریزی ماہنامے "ہیرالڈ" کی جانب سے اسے 1995 کا اردو کا بہترین ناول قرار دیا گیا تھا۔ اس انتخاب میں ان کے اسی ناول میں سے چند صفحات شامل کیے گئے ہیں۔

یہ ناول اس طاقت کے خلاف سینہ سپر ہونے والی اس تنظیم کی کہانی ہے جو ملک کو غیر جمہوری شکنجے سے نکال کر بائیں بازو کے راستے پر ڈالنا چاہتے تھے۔ یہ ترقی پسند نوجوان تھے جن کے اندر انسانی برابری کا جذبہ موجزن تھا۔

"گمان" دو دہائیوں پر پھیلا ہوا قصہ ہے۔ کبیر، ناول کا اہم کردار اور اس کے ساتھی معاشرے میں بہتری لانے اور اپنے نظریے کو ملک میں نہ صرف قبول کروانے بلکہ اسے سیاسی عمل کا حصہ بنانے کے لیے بھی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

ارشد وحید نے یہ ناول ایک رومانوی ماحول کے اندر رہتے ہوئے لکھا تو ضرور، لیکن کہیں بھی رومانیت نہیں تھی۔ انھوں نے انفرادی اور اجتماعی جذبات، احساسات اور خواہشات کو کہانی کے اندر ایسے سمویا ہے کہ انسان کی سوچ کی خود غرضی کے ساتھ ساتھ اس کا بے لاگ پن تمام تر تضادات کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

"گمان" کی کہانی کا آغاز ایوب خان کے خلاف ہونے والی تحریک سے ہوتا ہے اور بھٹو کے دور میں سے گزر کر ضیاء الحق کے آخری دنوں تک چلتا ہے۔ کبیر جب اس نظریاتی جدوجہد کا حصہ بنتا ہے تو وہ اپنے ساتھ امیدوں کو بھی لے کر میدانِ عمل میں اترتا ہے اور آخر میں وہ ایک شکست خوردہ اور مایوس شخص ہوتا ہے۔ کیا نظریہ اور امید اسے چھوڑ گئے؟

ارشد وحید کا ناول اپنے دور کے چند اہم ناولوں میں اس لیے شمار کیا جاتا ہے کہ یہ بائیں بازو کی تحریک پر ایسی تحقیق ہے جس میں اس نے حقائق کو ایسے قصے میں بیان کیا ہے جو معلوماتی ہونے کے ساتھ ایک المیہ بھی ہے۔

گمان

سالِ اشاعت:1995

ارشد وحید

یہ ملک میں تبدیلیوں کا دور تھا۔ 70 کی دہائی کا درمیانی عرصہ تھا۔ ملک میں نئی حکومت آئے تین چار سال ہو چکے تھے۔ زندگی ہر سطح پر کروٹ بدل رہی تھی۔ بہت سے حادثات جو لوگوں کے تصور سے بہت اجنبی تھے، رونما ہو چکے تھے۔ ابھی لوگ اس سے سنبھل نہ پائے تھے، کہ ایک بالکل ہی مختلف نسل، اپنے نئے خوابوں کے ساتھ متحرک ہو چکی تھی۔ ان کے پاس گئے دنوں پر ماتم کرنے کی فرصت تھی اور نہ ہی خواہش۔ اس کے برعکس بہت سی باتیں جو ان کے تصورات سے نئی نئی آشنا ہوئی تھیں مگر گرفت سے دور ہی محسوس ہوتی تھیں، اب نزدیک آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ کبیر کو یہ سب نیا اور دلچسپ لگتا تھا۔ ان کے گھر کے قریب ہی چائے کا کھوکھا تھا جو گزشتہ انتخاب میں ایک پارٹی کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ یہیں وہ آتے جاتے مرتضیٰ کو دیکھتا تھا۔ پانچ سال پہلے ہونے والے انتخابات کے نتائج کی ساری رات، مرتضیٰ ایک لمبا سا اوور کوٹ پہنے، مفلر لپیٹے ریڈیو پر نتائج سنتا رہا تھا۔ صبح تک وہ اسی طرح وہاں بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر تھکن اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ کافی عرصے تک وہ دکان دفتر کے طور پر ہی استعمال ہوتی رہی۔ مگر مرتضیٰ وہاں اب کم ہی آنے لگا تھا۔ کبیر حال ہی میں سکول سے فارغ ہوا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں آ کر بیٹھنے لگا تھا۔

اب بھی مرتضیٰ وہاں آتا تو اس کا لہجہ بہت مختلف ہوتا تھا۔ اس حکومت سے جلد ہی اس کی توقعات اٹھنے لگی تھیں۔ وہ اب پہلے سے زیادہ سنجیدہ اور اداس نظر آتا تھا۔ اس کے لہجے

میں لگی ہوتی، مگر وہ پھر بھی ان لوگوں سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ توحید ان دنوں اکثر اس کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ ایک تو وہ مرتضٰی سے کافی متاثر تھا اور وہ اکثر اس سے باتیں سن کر انھیں اپنے دوسرے دوستوں کے سامنے دہرایا کرتا تھا۔ دوسرے مرتضٰی سے براہِ راست تو نہیں مگر اس کے حلقے میں شامل دوسرے لوگوں سے جو حکومت سے قریب تھے اس کے چھوٹے چھوٹے مفادات وابستہ ہونے لگے تھے۔ مثلاً یہی کہ ان لوگوں سے مل کر اس نے بہت سے جعلی راشن کارڈ بنوا رکھے تھے، اور ان سے حاصل شدہ چینی بلیک کر کے وہ اتنے پیسے حاصل کر لیتا جو اس کی کالج کی نئی اختیار شدہ زندگی کے اخراجات کے لئے کافی ہوتے تھے۔ اور ظاہر ہے یہ پیسے اسے گھر سے نہیں مل سکتے تھے کہ گھر سے لئے گئے پیسوں کے تمام خرچ کی ایک ایک تفصیل انھیں اپنے باپ دین محمد کو بتانا ہوتی تھی۔ توحید اور یہ سب لوگ اپنے حال میں خوش تھے، مرتضٰی کا کیا تھا، اس کے بارے میں تو سنا تھا کہ وہ سکول کے زمانے سے ہی سارے استادوں سے لڑ بھڑ جاتا تھا اور ایک بار سکول کا فرنیچر تک توڑ پھوڑ دیا تھا۔

اس شام کبیر پہلی بار توحید کے ساتھ مرتضٰی کے گھر گیا۔ بہت عرصہ شہر سے غائب رہنے کے بعد ایک دو روز ہوئے وہ واپس آیا تھا۔ مرتضٰی کا باپ ایک تحصیلدار تھا جس نے ریٹائرمنٹ کے بعد قریبی مسجد میں جو اس نے بنوائی تھی امامت شروع کر دی تھی۔ ابھی پچھلے ہی سال اس کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد بھی گھر کے رکھ رکھاؤ اور رہن سہن میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ سنا تھا کہ قریبی مارکیٹ کی کئی دکانیں انھیں ترکے میں ملی تھیں جو ان کی آسودہ گزر اوقات کا باعث تھیں۔ جس وقت وہ اس کے گھر پہنچے تو وہ کمرے میں موجود چیزیں الٹ پلٹ کر کے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور اپنی تلاش میں مصروف رہا۔ تھوڑی دیر بعد تکیے کے غلاف سے کاغذوں کا ایک پلندہ برآمد ہوا، اور اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر نمودار ہوئی۔ اس نے انھیں الٹ پلٹ کر پھر دیکھا اور

انہیں میز کی دراز میں رکھ دیا۔ پھر اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی، کرسی کھینچ کر ان کے پاس بیٹھا اور توحید سے گپ شپ میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں نے شطرنج کھیلنا شروع کر دیا۔ کبیر خاموشی سے وہاں بیٹھا رہا۔ کمرے میں ہر طرف بے ترتیبی تھی۔ فرش پر بے شمار ادھ جلے سگریٹ اور بیڑیوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ کپڑے الماریوں کے دروازوں پر لٹکائے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ٹوٹتی ہوئی زنجیروں اور کسرتی بدن والے، آسمان کی طرف تکتے ہوئے ہاتھوں میں مشعل لئے انسانوں کی تصویروں والے زرد اور سرخ پس منظر کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں اوور کوٹ پہنے اور بڑی سی داڑھیوں والے دو آدمیوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ کارنس پر ایک چھوٹا سا مجسمہ رکھا تھا۔ سیاہ رنگ کا یہ مجسمہ ایک دراز قد آدمی کو تھا، جس نے انہیں کی طرح کا ایک لمبا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی انگلی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بہت بڑے مجمع سے خطاب کر رہا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں پڑے ٹرنک میں ایک اخباری کاغذ والے پوسٹر کا ایک کونا لٹکا ہوا تھا۔ سرخ پس منظر میں یہ سیاہ رنگ سے بنا ہوا ایک نوجوان شخص کا خاکہ تھا۔ جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی، سر پر ایک سپاہیوں والی ٹوپی رکھی تھی جس کے سامنے کے رخ پر ایک ستارہ بنا ہوا تھا اور اس کے نیچے انگریزی میں لکھا تھا "چے گویرا" کمرے میں گہری خاموشی تھی اور وہ دونوں اپنی اپنی چالیں سوچنے میں مصروف تھے۔ کمرے کا ایک دروازہ جو باہر کی طرف کھلتا تھا وہاں سے کبیر نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں سودا لئے دروازہ کھول کر گلی سے گھر میں داخل ہو رہی ہے۔ کبیر اسے دیکھنے لگا۔

"یہ گھر کی ملازمہ ہے۔" مرتضیٰ نے کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری اماں اور بہنیں شرفاء کے گھرانے کی سمجھیں جاتی ہیں۔ اس لئے وہ وہ کرتی ہیں اور کوئی چیز لینے گھر سے باہر نہیں جا سکتیں۔ اپنے پردہ اور عزت کو قائم رکھنے کے لئے انہیں ایک ایسی عورت کی

ضرورت تھی، جس کے یہ مسائل نہ ہوں، جو اندر باہر آسانی سے آجا سکے سو یہ اللہ وسائی ہے جو ہماری عورتوں کے پردے کو قائم رکھنے کے لئے یہاں کام کرتی ہے۔"

کبیر، جس نے اس لڑکی پر نگاہیں مرکوز کی ہوئیں تھیں ایک دم گھبرا گیا۔ جس قدر اچانک مرتضیٰ نے بولنا شروع کیا تھا، اسی طرح اچانک وہ دوبارہ شطرنج پر جھک کر اپنی چال سوچنے میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اس کے کمرے پر دستک ہوئی مرتضیٰ نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں اندر داخل ہوئے۔ مرتضیٰ نے بڑے تپاک سے اس لڑکے کو گلے لگایا۔ "یہ جمال ہے۔" اس نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، تعلیم چھوڑ کر آج کل کسان بنا ہوا ہے اور کسانوں میں کام کرتا ہے۔ بڑا زبردست آدمی ہے۔ یہ فہمیدہ ہے جرنلزم میں ایم اے کر رہی ہے۔ اور یہ اس کی چھوٹی بہن عفت ہے۔ ابھی سیکنڈری سکول کے آخری سال میں ہے۔ مگر اپنے وقت سے بہت آگے۔ ہمیں اس سے بڑی امیدیں ہیں۔"

فہمیدہ اور عفت نے انہیں سلام کیا اور بڑھ کر توحید اور کبیر سے ہاتھ ملایا، جن کا تعارف اب مرتضیٰ کروا رہا تھا۔ انہوں نے شطرنج کی بازی ایک طرف ہٹا دی اور گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ جمال اور فہمیدہ یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ یونیورسٹی تو جمال نے کب کی چھوڑ دی تھی مگر جب بھی وہ مظفرپور آتا فہمیدہ سے ملنے ضرور آتا۔ فہمیدہ دراز قد اور تیکھے نقوش والی ایک خوش گفتار لڑکی تھی جس کے ہر انداز سے نفاست اور سلیقے کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کے برعکس عفت کے نقوش واجبی سے تھے، تاہم اس کا انداز جارحانہ تھا۔ اس کی ہر بات ہر حرکت میں تیزی تھی۔ وہ کبیر کے بالکل پاس بیٹھی تھی جو پہلی بار کسی لڑکی کے اتنے قریب ہونے سے گھبرایا ہوا تھا۔ عفت نے ابتدائی بات چیت کے بعد اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا اور اس سارے عرصے میں اس نے ایک لمحے کے لئے بھی مرتضیٰ کے چہرے سے نظریں

نہیں اٹھائیں تھیں، جو مسلسل مختلف موضوعات پر بے تکان گفتگو کیے جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا
جیسے وہ اس کی باتوں کے اسرار میں گم ہے اور گرد و پیش کا اسے کوئی دھیان نہیں رہا تھا۔ اس
نے بے دھیانی میں مرتضیٰ کی ایک ادھ جلی بیڑی اٹھائی اور دیر تک اسے ہاتھوں سے ملتی رہی
اور پھر اسے قریب پڑی ایش ٹرے میں ڈال دیا۔

"کچھ کتابیں وغیرہ پڑھنے کا شوق ہے" فہمیدہ نے کبیر سے پوچھا۔

جمال اور مرتضیٰ اس دوران کسی مسئلے پر الجھے ہوئے تھے جب کہ توحید ان کے
قریب بیٹھا بیٹی تن سوفینی کی پینٹ کے الٹے کیے پائنچوں سے مٹی نکالنے میں مصروف تھا۔

"ہاں ہے!" کبیر نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کس قسم کی؟"

"ہر قسم کی"

فہمیدہ ہنس پڑی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

کبیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"لگتا ہے مرتضیٰ کی طرف پہلی بار آئے ہو۔"

کبیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس کے پاس بڑی اچھی اچھی کتابیں ہیں۔ جاتے ہوئے لے جاؤ" فہمیدہ نے کہا۔

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں داڑھی والی تصویروں پر سے مٹی جھاڑنے لگے۔

"ارے یار مارکس اور اینگلز کی تصویروں پر سے مٹی تو جھاڑ لیا کرو" فہمیدہ بولی اور
پھر اس نے سامان کی طرف انگلی اٹھائے شخص کے سیاہ رنگ کے مجسمے کو صاف کرتے ہوئے،
ہنستے ہوئے کہا "اور کامریڈ لینن کے ساتھ بھی تم کوئی اچھا سلوک نہیں کر رہے۔"

اس دوران جمال اور مرتضٰی کی گفتگو سرگوشیوں میں داخل ہو چکی تھی، اور وہ سارے لوگوں سے بالکل الگ دکھائی دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اٹھے اور باہر کے دروازے کی طرف بڑھے۔

"ہم لوگ ایک کام سے جا رہے ہیں ایک آدمی سے ملنا ہے۔ آدھے گھنٹے میں آجائیں گے تم لوگ بیٹھو۔ میں چائے کا کہہ دیتا ہوں۔ بس ابھی آئے۔" جمال نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"لو یہ اچھی بات ہے" عفت چڑ کر بولی "ہم آپ سے ملنے آئے اور آپ جا رہے ہیں۔"

"بس ایک چھوٹا سا کام ہے، ابھی آجائیں گے" مرتضٰی نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایک مضمون بھی لکھا تھا آپ کو دکھانا ہے" عفت بولی۔

"بس ابھی آیا، آکر دیکھ لوں گا" مرتضٰی نے بغیر پیچھے دیکھے جواب دیا اور جمال کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"یہ گرمی بھی کبھی ختم ہوگی!" عفت گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولتے ہوئے بڑبڑائی۔ "ستمبر کا مہینہ ختم ہونے کو ہے۔ مگر یہ حبس اور حدت ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی"، اس نے سوچا۔ باہر گلی میں موسم کی شدت سے بے پروا دو لڑکے اینٹوں کی وکٹیں بنا کر کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ کافی دیر تک انہیں کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی، حتیٰ کہ اندھیرا پھیلنے لگا اور لڑکے آہستہ آہستہ کھیل بند کر کے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ وہ کھڑکی کھلی چھوڑ کر واپس مڑی اور قریب پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی اور گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے

میں کمرے میں پڑی مختلف اشیاء اور کھڑکی سے باہر کے منظر پر نظریں مرکوز کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھیں درد کرنے لگیں اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہی ایک جیسے دن، ایک جیسے موسم، یہ سارے سال لگتا ہے جیسے ایک ہی جگہ ٹھہرے رستے میں بیٹھے ہیں۔ غربت اور کسمپرسی سے لڑتا ہوا گھر ہے جس کے رہنے والے سب اپنے آپ سے ہی خوفزدہ ہیں، سمجھ نہیں آتی کسی فرد سے بات ہو رہی ہے یا اس کی پرچھائیں سے، کتنی ہی دیر وہ یونہی بے سدھ نیم دراز رہی۔ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کمرے میں روشنی ہوئی، دروازے پاس فہمیدہ کھڑی تھی۔

"کھانا کھالو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اس کے حسن کو غربت نے کچھ نہیں کہا بلکہ اب تو پہلے سے بھی زیادہ حسین نظر آتی ہے"، اس نے فہمیدہ پر نظریں جماتے ہوئے سوچا۔ فہمیدہ کچھ دیر تک کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر قریب آکر نرمی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے بولی۔

"آؤ چلیں۔"

وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔

دوسرے کمرے میں اس کی ماں کھانا لگا رہی تھی۔ "وہی پرانے، سبز پلاسٹک کے برتن!"

اس نے جگ میں پانی ڈال کر وہاں رکھتے ہوئے سوچا اور فہمیدہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ تینوں خاموشی سے کھانا کھانے لگیں۔

"مظفر بھی یہاں ہمارے ساتھ ہوتا تو" اس کی ماں نے کسی سرگوشی سے انداز میں کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو اور فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اپنے بھائی مظفر کا سراپا وقت کی آنکھوں کے سامنے لہرایا، مگر وہ خاموش رہی۔ وہاں سب سے بڑا تھا اور جب اس نے بی اے کر لیا

تو اس کی ماں نے بات بات پر اس کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ اس کا خاوند دوسری شادی کر کے کب کا اس ملک سے جا چکا تھا۔ اب وہ ہر قدم پر اسے یہ احساس دلاتی تھی کہ تم ہی اس نے اس گھر کو سنبھالنا ہے۔

ایک روز اس نے ماں سے کہا "تم اپنی محرومیوں کا انتقام ہم سے کیوں لیتی ہو" اس روز ماں کمرہ بند کر کے مسلسل روتی رہی۔ اگلے روز مظفر خاموشی سے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی ملازمت کر لی تھی اور ہر ماہ انہیں پیسے بھیج دیتا تھا۔ مگر ملنے کبھی کبھار ہی آتا۔

ماں کی بات پر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔
عفت تھوڑی دیر بعد وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ کمرے میں گئی اور اپنی الماری کھولی۔ چھوٹی چھوٹی موم بتیاں وہ کالج سے واپس آتے ہوئے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس نے ان کا پیکٹ اٹھایا اور چھت پر چلی گئی۔ چھت پر کونے میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں ایک چارپائی اور کچھ فالتو سامان رکھا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے چارپائی باہر نکال کر اس پر ایک چادر بچھائی اور ایک چھوٹا سا میز نکال کر سامنے رکھا۔ اور اس پر موم بتیاں رکھنے لگی۔ پھر وہ انہیں یونہی میز پر چھوڑ کر منڈیر کے پاس کھڑی ہو کر گلی میں جھانکنے لگی۔

آج اس کی سالگرہ تھی۔ زندگی بھر اس نے کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی۔ اس تقریب کا تصور اس گھر میں مضحکہ خیز تھا۔ آج اسے سوجھا کہ وہ خود ہی اس کا تھوڑا بہت اہتمام کرے گی۔ مگر اب اس کو یہ سارا عمل فضول لگنے لگا تھا۔ گلی کا زیادہ حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف کونے پر لگے کھمبے کا بلب سلامت تھا جس کی نحیف و نزار روشنی اس اندھیرے میں کسی سائے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ حبس سے بچنے کے لئے گھروں کے باہر کرسیاں یا چارپائیاں بچھا کر بیٹھے تھے۔

وہ منڈیر کی دیوار سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس گلی میں وہ برسوں سے رہتے آئے تھے اور سب انھیں جانتے تھے۔ اس گھر میں تہمینہ کے سیاسی روابط کی بنا پر اکثر لوگ وہاں آتے تھے اس لئے ان کے بارے میں قیاس آرائیوں اور شکوک وشبہات کا سلسلہ ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ اس گھر کے باہر اگر کوئی نہ بھی کھڑا ہو تو بھی ہر گزرنے والا شخص اس کی دیواروں کے پیچھے کسی کہانی کے تانے بانے بننے میں مصروف ہو جاتا۔ گو کہ کسی نے انھیں براہ راست کچھ نہیں کہا تھا، پھر بھی ایک غیر مرئی محاصرے کی سی کیفیت ان کی نفسیات میں رچ بس گئی تھی۔ سامنے کے مکانوں میں بائیں طرف اس کے چچا کا گھر تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کا بیٹا کلیم موٹر سائیکل پر اپنی بیوی کے ساتھ کہیں سے واپس آیا تھا۔ اس فربہ اور زیورات سے لدی پھندی عورت سے بمشکل ہی موٹر سائیکل پر بیٹھا جا رہا تھا۔ مگر کلیم کو اپنے بازو کی گرفت میں لئے موٹر سائیکل پر بیٹھے وہ بلند آواز سے ہنس رہی تھی۔ کلیم درمیانے قد کا بھاری بھرکم نوجوان تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور بال گھنگریالے تھے۔ بچپن میں وہ اکثر ان کے گھر جایا کرتی تھی۔ کلیم اس سے سات آٹھ سال بڑا تھا۔ ایک بار اس نے اسے کہا، "آؤ تمہیں کچھ نئے کھلونے دکھاؤں"۔ اس کے ہاتھ میں بہت سی ٹافیاں تھیں جو اس نے عفت کو دے دیں۔ عفت خوشی خوشی اس کے ساتھ کھلونے دیکھنے چل پڑی۔ وہ اسے گھر کے ایک نیم تاریک کونے میں لے گیا اور اس کے ہاتھ اس کے جسم کے چھپے ہوئے حصوں کو ٹٹولنے لگے۔

"کھلونے؟" اس نے گھبرا کر کہا۔

"ابھی لاتا ہوں!" کلیم کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔ اسکے ہاتھوں کی انگلیاں اور تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ درد اور دہشت سے گھبرا کر وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور صرف گھر پہنچ کر ہی اس نے دیکھا کہ اس کی شلوار پر خون کے سرخ دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس دن کے بعد وہ کبھی ان کے گھر نہیں گئی تھی مگر یہ یاد اکثر ایک ڈراؤنے خواب کی طرح اس

کے حواس پر نمودار ہوتی اور اسے وہ سارا درد دوبارہ محسوس ہونا شروع ہو جاتا۔ ابھی بھی کچھ دیر پہلے ان کے قہقہے اس اذیت کو دوبارہ اس کے تصور میں پھینک گئے تھے۔ وہ دیوار سے پرے ہٹ آئی۔ پچھلی دیوار کے ساتھ ایک ٹونٹی نصب تھی۔ جس کے ساتھ ایک پائپ لگا ہوا تھا۔ اس نے ٹونٹی کو کھول کر دیکھا۔ پانی آرہا تھا۔ اسنے چھت پر چھڑکاؤ کرنا شروع کر دیا۔ شروع میں تو فرش سے نکلتی بھاپ نے حبس میں اور اضافہ کر دیا۔ مگر آہستہ آہستہ ٹھنڈک اور دھیرے دھیرے چلتی ہوا نے فضا کو خوشگوار بنا دیا۔ اس نے کمرے سے ایک پرانا شور مچاتا پیڈسٹل نکالا اور اسے چلا کر چارپائی پر لیٹ گئی اور کتنی ہی دیر کے بے کنار خوابوں میں رہ گئی، گریزپا نیند کے تعاقب میں بھٹکتی رہی۔ پھر وہ اٹھ بیٹھی اور نیم غنودگی کے عالم میں اس نے موم بتیوں کا پیکٹ اٹھایا۔ پنکھے کو بند کیا اور سامنے پڑے چھوٹے سے میز پر سترہ موم بتیوں کو جلایا۔ کچھ دیر تک وہ روشن کی ہوئی موم بتیوں کو دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کا جسم ایک نامعلوم احساس سے بھیگنے لگا اور اسے یوں لگا جیسے موم بتیوں کے ہر شعلے میں اسے مرتضٰی کا عکس نظر آرہا ہے۔

مرتضٰی کو اس نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ ابھی ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ وہ ان کے گھر مظفر اور فہمیدہ سے ملنے آیا تھا۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے مہمانوں کے لئے چائے پہنچانے کا ذمہ حنا ہی کے ذمے ہوتا تھا۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو مظفر اور مرتضٰی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جبکہ فہمیدہ خاموش بیٹھی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی روشن آنکھیں تھیں اور لگتا تھا اس کی پتلیاں ہر وقت حرکت کر رہی ہیں۔ وہ چائے میز پر رکھ کر فہمیدہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔۔ اس نے بغیر اسکی طرف دیکھے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ کچھ دیر بعد جب اسنے چائے کا کپ اسکے ہاتھ میں تھمایا تو اس نے کہا۔

"کیوں بھئی، کس کلاس میں پڑھ رہی ہو۔!"

اس نے بتایا۔

"کون سے مضامین پسند ہیں۔"

"سارے ایک جیسے ہی لگتے ہیں" عفت نے کہا۔

وہ ہنس پڑا۔

"کچھ اور بڑی ہو جاؤ پھر ہم بھی تمہیں پڑھائیں گے"۔ اس نے سرپرستانہ لہجے میں اس سے کہا۔ "اصل علم ہمارے سکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں سے باہر ہے۔"

اس کے بعد وہ پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گیا۔ جب تک چائے پی جاتی رہی عفت وہیں بیٹھی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کی باتیں بہت انہماک سے سن رہی ہے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ وہ بس اس کی آواز سن رہی ہے، الفاظ نہیں اور اس کی آنکھیں چائے کے کپ کو نفاست سے تھامے ان ہاتھوں پر مستقل مرکوز تھیں، جن کی سفید جلد پر سیاہ بال چمکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بہت تیزی اور جوش سے بول رہا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بولتے ہوئے اس کی آواز ہکلانے لگتی اور وہ کسی موزوں لفظ کی تلاش میں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتا۔ اور پھر کسی پر غرور مسکراہٹ کے ساتھ اپنی گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیتا۔ کافی دیر بعد اچانک وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے فہمیدہ سے کہا "یہ چائے تو اور پلاؤ"

فہمیدہ نے عفت کو اشارہ کیا اور وہ اپنی جھنجھلاہٹ کو دباتے ہوئے چائے کے برتن اٹھا کر باہر نکل آئی۔

اس کے بعد بھی وہ اکثر ان کے گھر آتا رہا۔ وہ فہمیدہ یا مظفر سے ہی ملتا۔ اس کے ہاتھ میں تھیلا ہوتا جس میں ڈھیر ساری کتابیں اور کچھ چھپے ہوئے کاغذ ہوتے۔ جب پہلے دن اس نے اسے دیکھا تھا اس سے وہ اب کہیں مختلف ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہر وقت کسی جلدی

میں ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے ہر وقت گھڑی دیکھتا رہتا اور کوشش کرتا کہ مقررہ وقت میں بات مکمل کر کے وہاں سے اٹھ جائے۔ صرف مرتضیٰ کی وجہ سے اس کو اس کے تھیلے میں پڑی کتابوں سے بھی دلچسپی ہونے لگی۔ اس کو ان کتابوں کی کوئی زیادہ سمجھ نہ آتی۔ مگر وہ محض اس سے گفتگو کا بہانہ تلاش کرنے کے لئے انہیں پڑھتی رہتی۔ وہ اس سے سوال کرتی جن کو سن کر وہ ہنس پڑتا۔ "ابھی اور پڑھو" وہ کہتا۔ "پھر تم سے بات کریں گے۔" مگر اسے یوں لگتا جو بات وہ اس سے کرنا چاہ رہی ہے اسے وہ سن ہی نہیں رہا بلکہ شاید وہ خود بھی اس سے بے خبر تھی۔ جس طرح اس کے جسم میں اس وقت کچھ معلوم اور کچھ نامحسوس تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں اسے یوں لگتا کہ اس کا تصور بھی اسکے بھرتے ہوئے بدن کا ایک حصہ بنتا جا رہا ہے۔ جس دن اس کا میٹرک کا رزلٹ آیا اس روز مرتضیٰ بھی ان کے گھر میں ہی تھا۔ اس روز مظفر بھی آیا ہوا تھا۔ وہ دونوں اور قمیدہ کافی دیر سے کسی مسئلے پر بات کر رہے تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی اور خوشی سے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "سکول کا دور اب ختم ہوا عزیزو"۔ پھر اس نے آواز کو ذرا مزید بزرگانہ بناتے ہوئے کہا "اب وہ کالج جائیں گے پھر یونیورسٹی۔" اور پھر وہ بات مکمل کئے بغیر ہنسنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ" مرتضیٰ نے کہا۔ وہ سب سنجیدگی سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے اب اپنی گفتگو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تو کچھ اہتمام کیا جائے"۔ مظفر نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کیک لاتا ہوں، باقی چائے وائے تم لوگ بناؤ۔" مرتضیٰ اٹھ کر کیک لینے چلا گیا۔ عفت کچن کی طرف چل دی۔ وہ چائے کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی بنانا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد مرتضیٰ واپس آگیا۔ وہ بیٹھک سے اس کی آواز آرہی تھی۔ "اگر یہاں انقلاب آیا ہوتا تو دیکھتے ہم اس خوشی کو کیسے شاندار انداز میں مناتے۔"

"وہ تو پھر جب آئے گا سو آئے گا۔ فی الحال تو اس پہ ہی گزارہ کرو۔" فہمیدہ کی آواز آئی اس کی آواز میں ہلکا سا تمسخر تھا۔

کچھ دیر بعد وہ جب دو چیزیں رکھنے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا وہ پھر کسی سنجیدہ بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ کیک کا ڈبہ کرسی کے قریب اوندھا پڑا ہوا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی اس کی آمد کا نوٹس نہ لیا، اور اپنی گفتگو جس میں تلخی کا عنصر نمایاں ہوتا جا رہا تھا اس میں مصروف رہے۔

"مگر یہ تاریخی جبریت ہے۔" مظفر کہہ رہا تھا، "ایسا تو ایک خاص عرصے میں ہوتا ہی ہوتا ہے اس کے بعد ہی اگلا مرحلہ آئے گا۔ ہمیں تاریخی حالات کے مطابق ہی کام کرنا ہے۔"

"یہ تاریخی جبریت سب فراڈ ہے۔ یہ سب اسی طرح ہے جیسے مولوی جنت کے خواب دکھا کر موجودہ جبر کو صبر سے سہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ تم لوگ بھی بس لکیر کے فقیر بنے رہو۔ کوئی طریقہ حتمی نہیں۔ ہمیں نئے راستے بنانے چاہئیں۔ تم لوگ بس مکھی پہ مکھی مارے جایا کرو۔ اور خوش رہو کہ بہت کام کر رہے ہو۔" مرتضیٰ نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" مظفر کی آواز بھی بلند ہونے لگی۔

"تم صرف حکومت بدلنا چاہتے ہو، لوگ نہیں۔ تم لوگ اسی طرح رہنا چاہتے ہو جس طرح باقی لوگ۔ ہمارے رشتے وہی پرانے ہیں۔ ہم نے اپنے لئے رول منتخب کئے ہوئے ہیں اور انہی کو نبھائے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کا جو تصور ہمیں سماج نے دیا ہے، ہم اسی عینک سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو یاد کراتے ہیں کہ تمہیں اب یہ کرنا

ہے یہ نہیں کرنا ہے معیاری ہوتے ہیں جو ہمیشہ سے چلے آ رہے ہیں۔" مرتضیٰ نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ان باتوں کا میری بات سے کیا تعلق" مظفر اب بیزار نظر آ رہا تھا۔ "اور تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ تمہاری باتوں کا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب" مرتضیٰ نے جیسے خود سے سوال کیا ہو اور اس مطلب کی تلاش میں اسے اپنا ذہن بھی خالی نظر آیا۔ وہ پریشان اور آزردہ خاموش ہو گیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو یہ صرف تمہارا مسئلہ ہے، ہم بہت خوش ہیں۔ اس سسٹم میں مگر کیا کریں ہر چیز اپنے حساب سے بدلے گی۔" مظفر کچھ دیر بعد نرمی سے بولا۔

"جس طرح تمہارا حال ہے اس طرح تو شاید کبھی کچھ نہیں بدلے گا۔ شاید تم خود بھی نہیں۔" مرتضیٰ تلخی سے بولا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں چلتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"چائے۔" عفت جو کافی دیر سے حیران پریشان کھڑی تھی، نے مرتضیٰ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مرتضیٰ نے ایک لمحے کے لئے اسے دیکھا۔ "سوری" اس نے کہا ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ آج تم پاس ہوئی ہو اور ہم اس کا جشن منا رہے ہیں۔"

وہ بیٹھ گیا۔ عفت نے سامان میز پر رکھ دیا۔

فضا میں تلخی ابھی برقرار تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے سب مصنوعی طریقوں سے اسے ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مظفر نے پلیٹ اٹھا کر مرتضیٰ کو دی اور باقی چیزیں اس کی طرف بڑھانے لگا۔ مگر مرتضیٰ کی بے چینی برقرار تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چل دیئے۔" فہمیدہ نے بظاہر خوش دلی سے پوچھا۔

"سگریٹ لینے جا رہا ہوں، ابھی آتا ہوں۔" مرتضیٰ نے کہا اور تھیلا اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"اب یہ نہیں آئے گا"۔ مظفر بولا۔ اس کی آواز رنجیدہ تھی۔ مگر ہر بات کو ایک ہی انداز سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

ماحول میں کشیدگی برقرار تھی اس نے عفت کو قریب بٹھا لیا۔ "میری بہن اب بہت بڑی ہو گئی۔ ہم سب سے زیادہ۔" اسے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ساری خوشی تو ہم نے برباد کر دی۔ ہمارے بھی کیا حالات ہو گئے ہیں۔"

"یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور ہم۔ لگتا ہے اس وقت کے انتظار میں یہ بھی رہن ہو گئی ہیں۔" وہ جیسے خود سے ہمکلام تھا۔ "ہم چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی محسوس نہیں کر سکتے۔ کسی بات میں بھی ہم اپنے سیاسی وجود کو فراموش نہیں کر سکتے"۔ اس کی آواز ایک موہوم دکھ سے لرز رہی تھی۔ مظفر، وہ اور فہمیدہ دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے آئندہ پروگرام کے بارے میں منصوبے بناتے رہے۔ عفت خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے کرسی کے پاس پڑا بھولا بسرا ایک اٹھایا اور اسے کاٹ کر ان دونوں کو دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد مظفر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس شام اس نے واپس جانا تھا۔

اسلم سراج الدین-(1947-2013)

اسلم سراج الدین گوجرانوالہ، پنجاب سے تعلق رکھنے والے اردو کے معروف لیکن انتہائی منفرد اور مختلف افسانہ نگار تھے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "سمر ساعر" 1997 میں منظر عام پر آیا اور اسے اکادمی ادبیات، پاکستان نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق ایوارڈ سے نوازا۔ ان کے ناول "تلاشِ وجود" کے حصے ادبی رسالوں "سویرا" اور "فنون" میں شائع ہوتے رہے۔یہ ناول مکمل صورت میں ان کی وفات کے تین برس بعد چھپ کر سامنے آسکا۔اس انتخاب میں ان کے اس ناول سے چند صفحات شامل کیے گئے ہیں۔

"تلاشِ وجود" اپنی طرز کا انوکھا ناول ہے جس کی شاید کوئی منطقی ابتدا تو ہو سکتی ہے لیکن منطقی انجام ممکن نہیں۔یہ ایک ایسا بیانیہ ہے جس سے انجام کی توقع وابستہ نہیں کی جا سکتی۔وہ سب حدود سے ماورا اور شاید تعریف سے مستثنیٰ ہے لیکن اس کے باوجود یہ اردو کا ایک اہم ناول ہے۔

ابتدائے آفرینش ہی سے تصورِ تلاشِ وجود انسانی علوم، سائنسی، نفسیاتی، مابعد الطبیعاتی، فلسفیاتی، اساطیری، روحانیاتی اور فنونِ سنگ تراشی، نقش نگاری، موسیقی، شاعری و اداکاری میں ضروری اکائی نہیں بلکہ مکمل لازمے کے طور پر موجود و مطلوب رہا ہے۔اسی طرح ادیان کے اوجِ کمال کو پہنچتے پہنچتے تلاشِ نفس کو تلاشِ حق یا خدا کے موافق قرار دینے کے پیچھے بھی دراصل یہی سوالِ اول کائنات ہی کارفرما نظر آتا ہے۔زہدیات و طریقت کی راہوں پر بدھ دو اتم تو شد کی بات ہو یا منصور حلاج کے نعرۂ مستانہ کی صدا کہ ان کے بیچوں بیچ بھی کو شدا آشکار رہی۔ سگمنڈ فرائیڈ کی وی ڈارمیز کے مطابق خوابوں کے بننے اور بکھرنے کے

عوامل ہوں یا نفسیات کی تحلیلِ نفسی اور شعور و لاشعور کی تہہ در تہہ جزئیات مگر ان سب کی پیچیدہ نفسیات ایک ہی طرح کی ہے اور اسی فکرِ اعظم و ازل سے متصل اور منور بھی۔

تلاشِ وجود کی حد میں اس وقت تک کے تمام تر سائنسی نظریات مثلاً [illegible] تھیوری آف اضافیت پارٹیکل فزکس، میٹا فزکس وغیرہ کے افکار سے بعنوان شعوری شد آگے گذرتے ہوئے عظیم تر مستور و مستفید سے کام لیتے ہوئے اُن کے منطقی معنیات کا اشارہ بذاتِ خود بڑے فکری و جبلی وژن لیے کا استعارہ ہے۔ اتنی بڑی بات یقیناً کسی بڑے فنکار یعنی شاعر یا فکشن نگار کے دماغ میں ہی وجود ہو سکتی ہے کہ تجربے و مجاہدے سے پہلے یہ چیزیں مستفید و مستور میں پل بڑھ کر جوان ہوتی چلی آئی ہیں۔ اقتدار کے ضمن میں ناولوں کے رنگا رنگ کردار اور ترکیب و سرگردانی کے ساتھ تلاشِ عظیم کی تہہ کے ساتھ ناولوں کی نامعلوم مقام کو اپنے اندر پیش بہا جہانِ معنی سموئے ہوئے ہے۔ تمام کردار مل کر ایک ایسی فنی اکائی کو تخلیق کرنے میں کامیاب تر ہیں کہ جہاں فن تخلیق اپنے انتہائی عروج پر ہے۔

تلاشِ وجود

سال اشاعت: 2016

اسلم سراج الدین

اثر وتی اور گنوار کی اساس

ایک بھاری تڑپا دھپ سے اس کی ناک پر آن پڑا۔ پھر چھما چھم مینہ برسنے لگا۔ سامنے اس گھاٹی کے پار سوکھے پہاڑ جو کسی سنگلاخ گمشدہ وقت کے رحم میں اس رجیم دھرتی پر برسائے گئے تھے، اور شاہ برمن سے منسل ہوتے تھے اس بات کو سرے سے خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہ صرف رکنی کا خیال ان پر برس رہا ہے۔ سو ہریالی کیوں پیچھے رہتی۔ سینہ سنگ کو چیر کر نکلی اور پدھر پدھر چڑھتی چوٹیوں کو جا پہنچنے لگی اور جوں ہر بوند کوئی شجر ہو پلک جھپکن میں اطراف گھنے زمردیں ہو گئے۔ ڈھلانیں چیڑ، چنار، بلوط، اور کیارسے ڈھک گئیں اور ان کے گھنے بن کے بیچوں بیچ تازہ پانی کی رواں میں نہاتا دھوتا مچھلیں تیرنے لگیں۔ ناگر شرمپ نہانے لگے۔ ایک سلسلہ سارے کا سارا جو سبز پوش ہو گیا اور جب ہر ایک شجر کی شفقی سرد ہو چکی اور وہ شجر گوں ہو گیا تو سب کے سب اشجار ایک گہری سبز آب سرخوشی میں ڈوبے روئیدگی کے قدیم گیت گانے لگے اور زمین آسمان کے بیچوں بیچ سارا ان تھے یا پھاڑوں، جھڑیاں تھیں یا جھالے جن کی پینگ جیسی گت پر گاہے پاس گاہے دور جاتے ایسے گیت پوران کی سماعت کو گدگدانے لگے، جن کے سرتال پردے کے پیچھے سے ہزار ہزار بخشی ہتھیلیوں سے توے اور توے سے چنگیروں میں اترتے پکوانوں کی بے نہایت پاپوری (Potpouri) کے اس طرف سے پوران کی ماں جو جانے کب سے کتاب پر جھکے اس کے سرآگے پوڑے رکھ گئی ہیں

اور اب شکر کا شیرہ ملے چھلکے آٹے کو چنبیل کے پتے سے توے پر پھیلا رہی ہیں۔۔۔رسوئی میں سے پکارتی ہیں:

"بیٹا! آپ چھوڑیں کہ نہیں۔۔ پوڑے ٹھنڈے ہو جائیں گے"۔۔اور وہ لقمہ توڑتے ہوئے کہتا ہے ۔"کیسے چھوڑ دوں اماں، کچے پڑے ہیں" اور پھر ہیزلٹ کہاں سر اٹھانے دیتا ہے۔ اس کی یہ سطریں تو مجھے رٹ ہی گئی جا بجیں حوالے کے لئے کہ:

Give me a clear blue sky over my head..and Then Three Hour's March to dinner and then to thinking..

اور جان میس فیلڈ کی سی فیور کہ

I must go down to the seas again. And all I ask is A Tall ship and a star to steer Her by ..

اور اماں آتی ہیں، دودھ کا گلاس لیے اور ان کے پیچھے آتی ہے مصیبت، "لائیے اماں مجھے دیجئے۔ میں پلاتی ہوں انھیں دودھ، پرچوں کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ آدمی فاقوں پر آجائے"۔۔۔یہ رکمنی کی بچی، ابھی کے گھر کیوں گھسی رہتی ہے ہر وقت۔۔۔اچھی ہمسائگی ہوئی! اماں آپ کی سہیلی تو گزر گئیں، اب بیٹا بھیجتی بیچ کی کھڑکی کو۔۔۔رکمنی کے ہاتھ سے گلاس لے کر وہ گھاٹی میں الٹ دیتا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے دودھ سے لبالب ہو کر کناروں سے چھلکنے لگی۔ پورن نے اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور ٹھنڈے میٹھے ابلے ماغ کی اوک بھر اوک پینے لگا اور جب تک اس کی جیبھ، تالو اور جی جان کا ایک ایک کانٹا نکل نہ گیا اسے خیال تک نہ آیا کہ گلاس بھر دودھ صورت دریا کس طرح بہہ نکلا۔

تلطفِ محفل کی خاطر اس نے ایک اوک اور بھری اور ادھر نظر کی جدھر سے گھاٹی
کا وہ سرتاپا سنگ پوش کنک چڑھا آتا تھا۔۔۔ مگر اب کہاں تھا وہ۔۔۔ جو۔۔۔ برتے بھی برتہ
پائے چھوٹے بڑے پتھروں، بولڈرز، گیشوں کا وہ لاؤ لشکر۔۔۔ بھیانک کنک! ! اگیا اپنی بات
مرکھیت رہا قصاب کا سب! جاؤ دوسرے سنگ سپاہیو! اتف ہے تمہارے تیوروں کہ بات بھی
کھائی تو کس سے، مسری عشق پیچاں سے، جس نے اپنے سبز و شاداب غالیچے کی بنائی کرتے
ہوئے آفاق کو اپنی دبیزت سے ڈھک دیا ہے۔ ان پتھر چاٹ طوک پودوں سے جو بنت کی اس
دیارت سے سر نکالے ہوا میں الکورے لے رہے ہیں، چنچل۔۔ پون جھکوروں سے بل کھاتی
نرمل ٹہنیوں سے، جن کے نیچے روح شیر پر دورویہ آم اور جامن اور توت اور بکائن کے درخت
ہیں، جو اپنی ٹہنیاں ایک دوسرے کے کندھوں پر رکھے سر جوڑے جانے کیا کیا قصے کہتے ہیں اور
جن کے گھنے پنوں کی شاداب تاریکی میں پرندے سہاگ کے گیت گاتے ہیں اور جب پکے ہوئے
آم اور جامن، پتے بل کھاتے دودھ کے نور پر گرتے ہیں تو اجلے بہاؤ کی سطح پر چاندی کی ایسی
کٹوریاں چھلک اٹھتی ہیں جن کے اپ روپ من بھاؤنے پن سے کوئل کوک اٹھتی ہے، پپیہے
کے دل میں ہوک اٹھتی ہے اور نرمل فاختہ کی کُر رکوو کُر رکوو کو پچھ اور دلدوز ہو جاتی
ہے۔۔۔ مگر وہ دودھ رس کی اس نہر کے سوتے کہاں تھے!

سبز و صورت کے اس حسن ہزار دام میں پسر رہے گوش و نگاہ کو چھڑا کر وہ آگے
بڑھا جہاں منظر پر دھند چھاری تھی اور دھند کے پیچھے بلند ہوتی گھاٹی کے ساتھ ساتھ
وستاوژن پر دودھ کی نہر ایک آبشار کی صورت گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اپنی اُپھان کی انتہا پر
پوران نے دیکھا کہ گھاٹی بھی دھند کا ایک مرتعش تودہ ہی ہے جو آہستہ آہستہ گھلتا ہے اور گھلنے
میں جیسے کوئی اس کی حساس انگلیوں کو نرمی سے ٹٹولتا ہو وہ تودہ لمس سے باہر ہو جاتا دکھائی دیتا
تھا۔ اس خوش مذاق تودہ دود کہ دھند کو وہ طفلانہ دلچسپی سے دیکھا کیا حتی کہ وہ پورے طور پر

کھل گیا اور اندر سے نمودار ہوئی سنگِ مرمر کی ایک چھوٹی سی پہاڑی، جس سے ٹیک لگائے کھڑی۔۔۔ اتنا وہ جانتا تھا کہ سکندر یونانی اور اس کے ساتھی برسوں ان اطراف میں براجتے اپنے دیوی دیوتا مارتے رہے تھے۔ یہاں تک آتے ہوئے اس کا گزر ایک ایسے گاؤں سے بھی ہوا تھا جس کا نام صاف اس عقل کی اندھی کے نام پر تھا، جس نے آفات و بلیات کی پٹاری کھول دی تھی۔۔۔ مگر ہوا ان پاروں کو جھوڑ لے جائے تو ہی وہ کہہ سکے کہ وہ وہی ہے۔۔۔ پنڈورا!؟! آنکھوں میں ایک غیر حتاسف مسکان بھر دنیا کو تجاہل سے دیکھتی ہوئی۔۔۔ یا۔۔۔ ڈکٹیسن کی کایا کلپ سے بس ابھی فارغ ہوئی آرتیمس (Artemis)، اپنے سامنے مسکینی سے سینگ ڈالے کھڑے بارہ سنگھے کو ڈانٹتی ہوئی: "کہو میاں بد نظرے پسند آئی یہ جون، ابھی وقت ہے چاہو تو گدھا بھی بن سکتے ہو، بولو!"۔۔۔ یا افرودتی، ہاں یہ وہی تھی کمر میں وہ معروف حلقہ پہنے جس کی سحر اثری سے کوئی نکل نہیں سکتا۔ ایک ہاتھ پیچھے کئے قامت میں سنگ مرمر کی اس چھوٹی پہاڑی سے بھی کچھ تعلق ہوئی، جس کے سہارے وہ کہنی کے بل ستادہ تھی۔ فاختاؤں کا ایک جھنڈ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اپنی سفید زندگی میں زندگی سے زندہ تر۔ جوں وہ اپنے لنگڑے شوہر کی حسرت بھری پیاس کے رس سے اپنی پیاس بجھاتی ہو، اس جھاگ جنی کے کھوہ پر ایک پر تجس چھتر چھایا تھا اور اس کے مدوردوہ تنوں میں دودھ فراوانی سے پرورش کرتا تھا وہ دھاروں دھار جھر جھر بہتا پہاڑی کے ایک طرف گر کر یہ دودھ چھینٹے اڑاتا کچھ تو افرودتی پر ہی پلٹ پڑتا کہ جیسے اپنی ہی بلوری گولائیوں سے دور نہ جانا چاہتا ہو اور کچھ پہاڑی سے ٹکرا کر فضا میں ذرا اوپر وقتی طور پر معلق دودھیا غبار کا حصہ بن جاتا مگر اس کا زیادہ حصہ جھرنوں اور آبشاروں سے مخصوص ایک ایسے آبی گیت کی گونج فضا میں چھوڑتا جس میں اپنے مقام سے گرنے والی تمام چیزوں کی چیخ شامل تھی، نیچے گر کر کھائی کو بھرتا تھا۔

ہر لوگ کے ہر۔۔۔ چیزوں جگہوں اور واقعات سے ناک تک ٹھنسے گیگ کے ہر،
کسی موٹروے پر رواں لانگ دیکھیز کی ٹکر سے بچکے پڑے یا برساتوں میں بچے کی کہانی کو تھامے
منہ اٹھائے چھت کو گھورتے آدمی کے منہ میں ٹپکنے کے لئے یا کسی زیوس کی طرف سے انٹرویو
کال کے منتظر روزگار کے راستوں پر جوتیاں چٹخاتے نیم دیوتا یا اولمپس پر جہاں تہاں ڈھیروں
ڈھیر پڑے کوک کینوں پر منڈلاتے ہوئے سیلوفین بادلوں کی آفت گری اور ٹکٹر کی
کو مینیجمینٹ پر آزردہ کسی دیوتا یا کسی چرچ پچھیا کی طرح قلاش دیوی کے حلق کو تر کرنے کے
لئے بنتے بنتے۔۔۔ کراں تا کراں پھیلے مسعود راحت کے اس ہالسیون (Halcyon) کی
ہری بھری سنگدھ سے اٹھ کر دودھ کی ایک ننھی دھار اپورن کے اندر پہنچ گئی اور ٹھنڈے
گہرے سکوت کی ایک ایسی لہر جو کامیابی سے اپنی فرصت آگہی کا پرور کر رہی تھی اسے بھگوتی
اس کی آنکھوں پر وہی دودھ گالے رکھنے لگی جو بچپن کی آشوب چشمی میں اس کی ماں رکھا
کرتی تھی مگر وہ آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا کہ چاگن شور مچاتا تھا بہت جھٹ تک رنگ میں ڈوبی
دھرتی کی سیر دیکھنے چلا آیا تھا گئی رت میں اپنے کئے پر ندامت سے سوچتے جھڑے پتے اٹھا
اٹھا ٹہنیوں پر ٹانک رہا تھا۔ جو ٹہنیوں سے چھوتے ہی ایک لمبا سانس لے کر بہار تہوار میں
شامل ہو جاتے مگر پہلے شرکت کی شرط۔۔ ثنا۔ ضرور بجالاتے۔

سب حمد و مناجات اس دیوی کے لئے جس نے دھرتی کو دودھ سے بھر دیا اور
ہر مگن بیتی اس کی چھاتیوں کے لیے جن کی صحت مندی کی ہم پر دیہ ہوئی اور ہماری گھاٹیاں
اور گھر آنگن دودھ سے لبریز ہو گئے اور جب ناندیں اور پنڈوؤں کے تھن چھلک اٹھے تو پیاسے
آشفتہ جسم و روح سیراب ہو گئے۔۔۔ دیوی کی دیا کو ہمیشگی ہو اور اس کے ازلی دودھ ہمیشہ
ہمارے سوکھے کی اور اٹھے رہیں اور ان گھنوں اور خشک پہاڑوں کی اور جن کی بہو بیٹیاں
میلوں دور تک پانی بھرنے جاتی ہیں اور جب واپس آتی ہیں تو ان کے برتن صرف آدھے

بھرے ہوتے ہیں، آدھا پانی دیوی کے ایک ساتھی دیوتا اپنا چار گھوڑا رتھ آسمان کے آر پار
دوڑانے لئے پی جاتے ہیں اور ان جنیوں کو بیا بنے سے پہلے جہاں کے لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ
جس گوٹھ گراں یتی پیاسی جا رہی ہے اس پر وہی دیوتا اپنی شدت کی حدت میں کس رخ پر ہوتا
ہے ۔۔۔ اور اس ہدر کف کو بھی دوام ہو جس سے تمہارا جنم ہوا کہ شاید کبھی اس کف کی
شروعات ہی ہمارے دریا کین کھاؤں سے نکل اپنی قدیم ڈگر پر آجائیں۔

پکشی پیشواں بتوں منی پتھروں کے مونہوں سے جاری پوان رچ لبی وہ دیو بانی
اطلب ہے کہ تب اس کے ہونٹوں کی بات میں تھی جب سرکتے سنبھلتے پر وہائے ابر کے اس پار
دیکھتی آنکھوں کی پتھرائی ان پر آن پڑی تھی اور اظہار حیرت کو مچل رہے لفظ بھرا
مار کر لاڑ گئے تھے اور پوران ارے ارے ۔۔۔ کہہ کر کھلے منہ آنکھیں پھوڑے ہو حرو دیکھتے رہنے
کے سوا کچھ نہ کر سکا جو عرب ۔۔۔ اپنے پتھر لے خواب سے جاگ، ایک ذرا کسمسا کر اس دیوی
نے سنگ مرمر کی پہاڑی سے ٹیک ہٹالی تھی اور بادلوں کے اڑتے نقاب کے پیچھے وہ مسکائی بھی
تھی شاید ۔۔۔ اور جال میں پھنسا پکشی، پوران، جال کی دھیرے دھیرے بڑھتی ناگزیر تنگی میں
پھڑپھڑایا۔ اس نے کہنا چاہا: دیوی ! ماتا ! تم تو مجھے مچل نہ دو۔ میں پوجک خادم ہوں تمہارا۔ یہ
مچل میرے لئے کیوں !؟ ۔۔۔ مگر اس کے ہونٹ صرف کپکپا کر رہ گئے اور وہ کچھ نہ کہہ سکا
اور نہ کہنے کی ضرورت ہی رہی تھی کچھ ۔۔۔ کہ اس دیولو کی تریا دیوی وغیرہ نے سکون سے
ہاتھ کو لبوں پر رکھے اور اپنی مسکان کو پر لوک سے اس لوک اترے ہوئے اس پر پنچھی بھر مچل
مزید چھڑکا اور جب کہ اس کی چھاتیاں ابھی تک بن برسا رہی تھیں وش کنیا کے مادہ سہاؤ سے
بولی: کیوں پورے چاند ایک ہوک دودھ اور تھیں لوگے ۔ لے لو۔ بات تمہاری بھی ہے۔ یہ سنتا
تھا کہ اسکے بے ذخموں میں نمک جاگ اٹھا۔ ہوک کی حالت میں جڑے اپنے ہاتھوں کو ماس
نے بیچ گھائی میں ال دیا۔ اس پر بھی شفا نہ ہوا تو ہاتھوں کی جڑت کو توڑ کر وہ ایک تیز شدت

کے ساتھ انگلیاں چلانے اور مٹھیاں کھولنے اور بند کرنے لگا۔ اس سے ہاتھوں میں کھردری
چٹانوں کی خشک ہوتی یادہری ہو گئی اور لہو رِسنے لگا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اب کسی رودھ یا
کسی بھی رنج کا شبہ اس کے ہاتھوں پر نہیں تو اس نے انہیں ایک آخری شدید جھٹکے کے ساتھ
جھاڑا اور اٹھ کھڑا ہوا پھر پشت پر بیگ کو سنبھالتے اور کسی بھی خاص طور پر گھاٹی کی طرف نہ
دیکھتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔

سڑک تک پہنچتے پہنچتے سورج ایسا سر آنے کو ہوا کہ اس کا سر پھولنے لگا اور پیاس
ایسی کہ الاماں۔ دانت دانتوں پر جما کر اگر وہ جبڑے بند نہ کر لیتا تو سوکھی کاٹھ کا ٹکڑا اس کی
جیبھ ضرور باہر نکل پڑتی۔ ایک لاری جس پر لدے پھندے لوگ کہیں سے آتے جانے کہاں
جاتے تھے، شور کی کئی طرح کی آوازوں کے ساتھ رینگتی ٹھیک اس کے سامنے آ رکی۔ گیٹ پر
لٹکے کنڈکٹر کی طرف متوجہ ہانپ نکال کر وہ بمشکل "بھنسی پور" کہہ سکا۔ کنڈکٹر نے لاری کو
کہیں ایک دھپ مار اور خاموش حقارت کی ایک نظر اس پر وہ ڈالی جو آن کی آن میں دھواں بن
کر پورن اور دنیا کے درمیان حائل ہو گئی: "او دمی دیا خصماں! ۔۔۔ کپ۔۔۔ دو۔۔۔" دھواں
چھٹنے پر پورن نے دیکھا کہ گالی دینے والا اس کے قریب ہی کھڑا ہے اور کئی طرح کی گچھیاں،
پٹ سن کے تھیلوں، ٹین کے صندوقوں اور پوٹلیوں کا بکھراؤ اس کے سامنے ہے۔ دھوئیں کی
کلولیتی بو اس کی ناک سے اتر کر آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ برامست بناتے ہوئے
وہ ہر چیز کو پہلی انگلی کے نشانے پر رکھ رہا تھا۔ کسی پوٹلی پر گنتی ختم کر کے وہ ہوا کی سلیٹ پر کچھ
جمع تفریق کرتا اور کسی تھیلے یا صندوق سے دوبارہ گنتی شروع کر دیتا۔ ان تھک گنتیوں کے بعد
اس نے سن کی ایک رسی نکالی اور تمام چیزوں کو ایک ساتھ باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے
پورن سے پوچھا: کتنے جاسو۔۔۔

"بھنسی پور"

"تے چھیتی آپارے پونچھ کے پھڑ لیتی سی اوتھے جان آئی لاری۔۔ سوچلے ٹرناسی
گمروں "اب پورن اسے کیا جاتا کہ گمروں۔۔ پیچھے سے۔۔ تو وہ سویرے ہی چلا تھا۔ مگر آدمی
نے بتایا کہ بنسی پور، صرف دو وقت لاریاں جاتی ہیں۔ ایک دوپہر سے دوسری شام سے پہلے۔
پہلی کی بات ہے کہ نکل چکی ہے اور دوسری اسے بے وقت آگے پہنچائے گی۔ تو کیا وہ کسی ایسی
لاری کے انتظار میں وہاں کھڑا رہے جو اسے آپارہ پہنچادے۔ "ہاں! اپنڈے ایڈا اوکھٹ اے کہ
کسے نئیں بنھاندے۔ پر تساں غافل نہ تھیا جے آپارے تیک ایس تھوڑے جیسے پندھ تے وی
اوہدے پندے لئی بڑیاں اوکھٹ گھاٹیاں نے"

"اگھانیاں"

"جی آ۔۔ اوکھٹ۔۔۔۔ تے کسے ہک چی دی وہ وہ تی ہے"۔۔۔ یہ کہتے ہوئے وہ کان
سے کان چیسا اور سامان کو ایک آخری گانٹھ دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ سوچ کر کہ یہ آدمی ابھی اپنی
راہ لے گا پورن کی پیاس بلبلا اٹھی۔۔۔ "پانی"۔۔۔

"بہوں لے گا آپارے۔۔۔۔ بے اتھاں اپڑے تے۔۔ " ان دیکھے شجر پوش سرچشموں سے
ترل ترل نکلتے رکتے کچھ سنگ تراشی کرتے پھر چل پڑتے شرمیلے میٹھے پانی جن کا اس کی پیاس
سے کچھ پیمان تھے اپنا عہد نبھانے کیچ کیچ بڑھتے تھے یا جو تہہ در تہہ اپنی لہروں کو تہہ کئے
کہیں ٹرائکس میں شانت پڑے ابھی ابر انگیز دھوپ تاپتے تھے مگر جو اس کی پیاس کی دلدوز چیخ
سنتے ہی تساہلی دھوپ پر برس پڑے تھے۔۔۔ ان سب، اور ان پر زیادہ ان سب دریاؤں نے
بھی جن سے اس کی کچھ یاد اللہ تھی جو نہی اس دیہاتی کی بات سنی ان کا زہرہ آب ہو گیا تو نہریں
ندی نالے بھلا کس گنتی میں تھے۔۔۔ دلا کھاتی تپن کا ایک بھبکا ایسا اٹھا کہ کوہستانی میدانوں کی
حرارت سے ڈر کر ورشا نے بھی عافیت اسی میں جانی کہ دبکی رہے سمدر کی آغوش ہی میں
کہیں۔۔۔ اب پیاس کیسے بجھے گی۔۔ پورن پسینے پسینے ہو گیا۔ زبان بھی باہر نکل تو۔۔۔ مگر اس

ڈر سے کہ رہا سہارا تر بھی کہیں جاتا نہ رہے وہ بڑبڑ کرتی کہ: سوچا نہیں تھا کہ ایسے ہووے ڈراؤ ہوں گے سارے سے سارے پانی۔۔۔ ترنت اپنے اندھیروں میں جا رکی۔ اسکی بڑبڑ مگر، آدمی نے سن لی تھی۔

"ڈاڈھی تریہہ لگی ہے؟" اس نے پورن سے پوچھا۔ پورن نے تھوک نگلتے ہوئے سر ہلایا۔ "تے اوہ آنکھوناں جی۔ سارے پانیاں ای کیوں متھا ہو لئے او" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹین کا ایک پچکا ہوا ڈبہ رسی کی باندھ سے چھڑایا اور سڑک پار کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سڑک کے کنارے تک اترز ڈھلان چھوڑ کر وہ دوسری طرف اتر گیا۔ جتنا بھی ہونٹوں پہنچا پانی ٹھنڈا تھا اور پورن کی جان میں جان لانے کے لئے کافی۔ آدمی، اس کی یہ کیفیت دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جنا کوئی مائی دا دودھ پیوے پیاس اوہدی اوہنوں اوہدے وچ دی اے لگدا اے مائی دا دودھ تساں وڈھیر پیتا اے" تس پر ڈبہ آدمی کی طرف بڑھاتے ہوئے جب ایک لاچار استفساری لاتعلقی کی شہ پر پورن کے منہ سے نکلا۔ "مائی ای ای"۔۔۔ تو آدمی قہقہا اٹھا۔۔۔ "اچھا میں تے دسرای گیا ساں پئی اوتھے ہر کسے نوں وکھو وکھ صورت دی مورت دکھائی دیندی اے۔ کسے نوں کائی تے کسے نوں کائی جانئے او جدوں میرا اکیل وادی اوہ عمر دی لانگا ہویا تے میں سمجھنے کہ وڈا؟ جیون ہو گی آپنی سس "ڈبہ رسی کی باندھ میں دوبارہ اڑساتے ہوئے وہ پھر ہنسا اور ایک تھوڑی مسکراہٹ پورن کے بشرے پر بھی پل بھر کو کھیل تو ضرور مگر چہرے میں چھپی چمک اٹھنے سے ہونٹ جب سکڑ سمٹ گئے تو یہ صرف آنکھوں میں باقی رہ گئی جہاں پلکوں کی نوکوں پر ان کے خاک کے ذرات کے پیچھے سے اس نے ضرور اس دیہاتی کو شہ دی ہو گی "ہو یا پتہ ہے کیہ!؟"۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔

تو روز راتیں سون توں پہلاں تسیوں چینڑی دودھ دا گلاس ایک ضرور دیں وے : کڑے دودھ دا تے اتے جو کجھ ملائی۔ شہدی توں تیندر تسیوں چینڑی دودھ پیوں بغیر۔ لئو بھرا جیا ایس توں مگروں او نہوں سب گلاں بھل گئیاں اک دودھ یاد رہ گیا۔ جھٹ کو مگروں اوسیوں جھل جیہا اٹھے تے بھجی آ کے میری بانہہ پھڑ لوے تے دودھ بارے کوئی گل آکھ کے چھم چھم ہنجو کیروی پئی ہر کیاں لیندی او تھے کھلوتی رہ جاوے۔۔۔"

"وے تو ریا!"۔۔۔ "دودھ دا گلاس وے"۔۔۔ "ارک جذا وے"۔۔ اتے ملائی دی موٹی موٹی تہہ وے"۔۔۔ تے اوداں تیک ساڈے پچھلے گلی اوندی رئی جد تیک پنجھوں دو بندے آ کے او نہوں کچی دھرو کے پرتا نئیں لے گئے۔ اوج او مگروں لنگھی۔ پر نال ای میری سوانی غش کھا گئی۔ میں دل وچ آکھیا سے آپنے دلوں تے میری اج دی رات توں برباد کرا ای چھڈی اے، پر میں دی اپنے دل دا پتر نے تیرا جوائی نئیں جے اج ای تیری دھی توں نال دیاں تیرے حکم موجب۔۔ او سیہہ آکھتی ساں ارک جذا۔۔ کوئی گل من کے جسراں کسے لوں اوسے گل دا جھل جیہا ئیں چڑھ جاندا او سراں ای میںوں دودھ دا جھل چڑھ گیا۔ اوتوں میری دوہتی رو ندی جائے تے ڈگ ڈگ جائے۔ تیرجی بر وندے دھوندے اگلے ڈھیندے رب رب کردے اسیں دودھ دی اوسے نیرآپڑے جھتوں تی نکھے کے آئے ہو۔ جانجی سارے ساں تھلے دھر کے دودھ کلہ تے جا بیٹھے۔ دودھ ویچی جاون تے گڑاھ کے آپنے آپنے دل دی مورت بھالن لئی اڈیاں چک چک ویکھن لگ پین۔ میں زنانی نوں آکھیا توں دی دودھ دے اک دو بک پی لے تے ارک جذا گھر جا کے سیں۔۔ اوہنے گھور کے میرے ول تکیا تے میں جھیتی نال آکھ : پیالا سی۔ او فیر رون لگ پئی۔ فیر میں ایک دو بک پیتے تے اکھیاں صورت ویکھن لئی جسراں بھیش متوں اتر دے وے ہولاں پچھے ڈھاکاں مار دی نظریں اوندی سی۔ میرا خیال سی میرے نال میری دوہتی دوون پاروں شیت او میںوں اج نظر نہ آوے پر بھرا جی او تھے تے میں

ہوراں تماشا ؤ قا۔۔۔ ویکھنا ایہہ آں کہ اک چتر نال ٹیک لائی ہواں؛ وطے میری سس کھل لے۔ رودہ کلاڈی تے اونہاں چوں دودھ ڈلھ ڈلھ پے رہیا اے تے تہرلوں بھر رہیا اے۔ لٹو بھرا جی میرا دودھ آ! انجیل اوسے ویلے لیہہ گیا پر ہاسے دا انجیل چڑھ پیا۔ بس بس میں دوہرا ہوئی جاتوں سے آپنی دوانتی نوں پچھاں: برکت بی بی بی تیری ماں نوں کیہ بنیاں"۔ رون دھون بھل کے او پریشان جتی ہو گئی۔ اوہدے بھانے تھوڑے میں پاگل ہو گیا ساں۔ میرے پیارا لے دوستاں بڑی مشکلاں میتوں قابو کیتا۔ نہاگی میری سس دی دی جدائی دا دکھ بچے دن سہہ نہ سکی۔ اینویں دو چار دناں چ ای پار ہو گئی۔ برتی میں فیر کدی ایس راہوں نہیں لنگھیا۔ اینوں اک ڈر جیہا اے کہ کتے بختی دی دروح نہ اگے اتے کھلوتی ہووے آپنے دوھاں نال بھری بھر دی۔۔۔ دی بختے پوایا جے"۔۔۔ پورن نے ذرا جھک کے سامان اس کے سر پہ رکھوا دیا سیدہ وہ گنوار ہل جل کر بوجھ کو برابر کرتے ہوئے پوچھنے لگا: "ہاں بھرا جی اک گل تے دسو اوتھے بدلاں اولے تساں کیہ ڈٹھا؟"۔۔۔ اور پھر پورن کو ہکا بکا چھوڑ کر بنا اس کے جواب کا انتظار کیے منہ موڑ کر چل دیا اور جانے کب سے اپنے وقت کے انتظار میں ہونٹوں کی پپڑی تلے دبکی بیٹھی ایک مسکراہٹ چپس کے باوجود لبوں کے چھوٹے لطیف تر و تازہ زاویوں کے ساتھ نمودار ہوئی اور پورن کو تر و تازہ کر گئی۔ یوں اپنی منزلوں کی کلفت بھلائے وہ گنوار کو پیچھے سے جاتا ہوا دیکھ ہی رہا تھا کہ اپنے پیچھوں پر وہ پھر مڑا: "تسی وی ہن ٹردے بنو۔ اینویں تھوڑا جیا لگاں آئیں بائیں سڑک آوے گی۔ گھابریا جے ناں۔ اینویں جھٹ دی جھوٹ اوتھے اک جھولا جیہا پیندا اے تے بندے دی مت ماری جاندی اے۔ اوتھوں کجھ نہیں اوندی پئی کدھر جاوے تے کدھراں نہ جاوے۔ ایہہ جھولا کدی ساڈی تی مردیاں دے مدان چاڑھ جاؤ گے۔ ایدھراں تسیں او مدان پار کیتا تے اودھراں آپ پارے اپڑے۔۔۔ تے مردیاں نال گھیں ناں لگ پئے تے۔۔۔"

"مردے!""

اشرف شاد (-1949)

اشرف شاد ہندوستان کے شہر مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مولانا اشرف تھانوی کے مقلد تھے۔ان کا نام اشرف اسی عقیدت کی وجہ سے رکھا گیا۔ تقسیم پاکستان کے بعد 1952 کراچی منتقل ہو گئے۔اسلامیہ کالج سے انٹر اور وفاقی اردو کالج، کراچی سے بی اے کیا۔کچھ عرصہ قانون کی تعلیم بھی حاصل کی لیکن اسے ادھورا چھوڑ دیا۔ بذا پسٹ، انگریزی سے صحافت میں ڈپلوما کیا۔ سڈنی کی یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز سے ایم اے آنرز کیا۔پاکستان میں متعدد اخبارات کے لیے کام کرتے رہے۔پچھلے طویل عرصے سے سڈنی، آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔

اشرف شاد کا پہلا ناول "بے وطن" 1997 میں شائع ہوا، جو بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے مسائل اور پریشانیوں پر مشتمل ایک ناول ہے۔اس پر کسی حد تک آپ بیتی کا بھی گمان ہوتا ہے۔ان کے اس ناول کو اکادمی ادبیات کی طرف وزیر اعظم ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1999 میں ان کا دوسرا ناول "وزیر اعظم" شائع ہوا۔ جو نوے کی دہائی کی پاکستانی سیاست اور اس کی اکھاڑ پچھاڑ پر مبنی ایک دلچسپ ناول ہے۔2004 میں ان کا تیسرا ناول "صدر محترم" اور 2017 میں "جج صاحب" شائع ہوا۔اس کے دو برس بعد ان کا ایک اور ناول "بی اے رستم، ٹی وی اینکر" شائع ہوا۔ مجموعی طور پر ان کے پانچ ناول اور تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔اس انتخاب میں ان کے ناول "بے وطن" سے چند صفحات شامل کیے گئے ہیں۔وہ ان دنوں اپنے دو نئے ناولوں پر کام میں مصروف ہیں۔

ادبی ایوارڈ ملنے کی وجہ سے ان کے پہلے ناول "بے وطن" کو شہرت ملی۔اس ناول میں کوئی مرکزی کردار یا ہیرو نہیں ہے۔بہت سی چھوٹی بڑی کہانیوں کو ایک دوسرے جوڑ کر

مربوط بنایا گیا ہے اور انھیں کہانی کی ضرورت بنایا گیا ہے۔ اس لیے اس ناول کا ہر کردار اپنی جگہ اہم ہے۔ کئی کہانیاں باہم مل کر اس ناول کی تشکیل کرتی ہیں۔ پھر اس ناول کا محل وقوع بھی کوئی ایک نہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ دیارِ غیر میں ملکوں ملکوں بھٹکنے والے پاکستانی شہریوں کی مصیبتیں، تکلیفیں اور دکھ سکھ کو اشرف شاد نے اپنے اس ناول کا بنیادی موضوع بنایا ہے۔ یہ ناول ایک ایسا تجربہ بھی ہے جس نے اپنی تکنیک خود وضع کی ہے۔

یہ ناول ہمارے دور کی بازگشت ہے۔ یہ ہمارے آج کا پس منظر اور پیش منظر ہے کیوں کہ اس کے کردار ہمارے روز و شب کا حصہ ہیں۔ یہ ناول اپنے قاری کو کئی طرح سے آسودہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے کہانی کی لذت سے سرشار کرنے کے ساتھ اپنے قاری کو غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔

بے وطن

سالِ اشاعت: 1997

اشرف شاد

سلیم امیگریشن اور کسٹمز کے مرحلوں سے نکل آیا تھا اور اب ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل کر اپنے سوٹ کیس اور ایک بیگ کے ساتھ حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس دیس میں وہ کٹھن سال کس طرح گزارے گا۔ کراچی ایئرپورٹ پر الوداع کہنے کے لئے آئے ہوئے اداس چہرے اور بھیگی آنکھیں ابھی تک اس کے دل میں تیر بن کر اٹکی ہوئی تھیں۔ لیکن یہ بعد کی پریشانیاں تھیں اس وقت اس کی پریشانی کچھ اور تھی۔ وہ اس شخص کا انتظار کر رہا تھا جو اسے لینے کے لئے آنے والا تھا۔ سلیم کا اپنا کوئی جاننے والا سڈنی میں نہیں تھا ایک دوست نے اس کے لئے اپنے کسی جاننے والے سے بات کی تھی جس نے اس بات پر اپنی آمادگی ظاہر کی تھی کہ سلیم کو ایئرپورٹ سے اپنے گھر لے آئے گا جہاں وہ اس وقت تک رہ سکتا ہے جب تک وہ خود اپنا انتظام نہ کر لے۔ سلیم آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف 5 فٹ 8 انچ کے چھریرے بدن، گندمی رنگ، مانگ نکلے ہوئے سیاہ گھنے بالوں والے ایک تیس بتیس سال کے نوجوان کو تلاش کر رہا تھا۔ سلیم کو تشویش یہ تھی کہ وہ کہیں آ کر نہ چلا گیا ہو۔ فلائٹ تو وقت پر آئی تھی لیکن سلیم کو امیگریشن اور کسٹمز میں کافی وقت لگا تھا۔ وہ باہر نکلنے والا اس فلائٹ کا آخری مسافر تھا۔ پھر بھی سلیم تقریباً ایک گھنٹے ایئرپورٹ کی عمارت کے باہر جما رہا۔ اس گھنٹے میں اس نے پہلی بار سڈنی کا کثیر القومی چہرہ دیکھا۔ ہر رنگ اور نسل کے لوگ سامان سے بھری ٹرالیاں یا پہیے لگے سوٹ کیس کھینچتے ہوئے استقبال کے لئے آنے والوں سے لپٹتے انہیں چومتے، ہونٹوں پر مسکراہٹیں اور آنکھوں میں خوشیوں کے دیپ سجائے گاڑیوں میں بیٹھ بیٹھ کر ہوا ہو رہے

تھے۔ جو اکیلے تھے انہیں معلوم تھا انہیں لینے کوئی نہیں آئے گا۔ وہ زیادہ تیزی میں آتے اور سیدھے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جاتے جہاں ان کے انتظار میں ٹیکسیوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی۔ یہ مناظر دیکھ کر سلیم کو تنہائی کا احساس اور شدید ہو رہا تھا۔

سلیم کو اب یقین ہو گیا تھا کہ بشیر احمد کو یا تو اس کا ٹیلی گرام نہیں ملا یا وہ انتظار کر کے جا چکا ہے۔ اس کے دوست نے سلیم کو بشیر احمد کا فون نمبر اور پتہ دیا تھا۔ سلیم دوبارہ ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوا تاکہ فون کر کے اپنے متوقع میزبان سے رابطہ کر سکے۔ سکے ڈال کر اس نے بہت احتیاط سے نمبر دبائے۔ لیکن دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز تھی۔ اس نے فون بند نہیں کیا بلکہ بہت صبر سے اس عورت کی آواز سنتا رہا جو ایک چھوٹی سی beep کے بعد پھر شروع ہو گئی تھی۔ یہ ریکارڈنگ تھی اور پیغام صاف تھا کہ فون اب سروس میں نہیں منقطع ہو چکا ہے۔ سلیم کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کی سوچیں معطل ہو گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کہاں جائے۔ جمعہ کا دن تھا، ہفتہ اتوار یونیورسٹی بھی بند ہو گی، اس لئے ایک نہیں کم از کم تین راتوں کا مسئلہ تھا۔ تھوڑی دیر وہ اس ریسیور کو گھورتا رہا جو اس نے ابھی تک ہک پر واپس نہیں رکھا تھا۔ شاید اسے توقع تھی کہ بشیر احمد اپنا ہاتھ ہلاتا ہوا ریسیور سے کود کر باہر آ جائے گا۔ مایوس ہو کر اس نے ریسیور ہک پر لٹکایا اور اپنی کھینچتا ہوا آہستہ آہستہ قدموں سے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ اس کے پاس ابھی ترپ کا ایک پتا اور باقی تھا۔ اس کے پاس بشیر کا پتہ تھا۔ اگر وہ اس پتے تک پہنچ جائے تو بشیر نہ ملا تب بھی وہ اس کے دروازے پر بیٹھ کر انتظار کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے ٹیکسی اسٹینڈ کا رخ کیا۔ سلیم ٹیکسی کی طرف بڑھا تو ڈرائیور نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا سامان ڈکی میں رکھا۔ سلیم اس کے ساتھ ہی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی تو ڈرائیور نے منزل کا پتہ پوچھا۔ ڈرائیور اسے شکل و صورت اور انگریزی کے بہت سادہ سے لہجے کی وجہ

سے اپنی طرف کا لگتا تھا۔ سلیم نے پتے کا کاغذ اس کی طرف بڑھایا تو ڈرائیور چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"آپ انڈیا سے ہیں یا پاکستان سے۔"

"پاکستان سے۔" سلیم نے بڑی تیزی سے جواب دیا۔

"اس پتے پر آپ رہتے ہیں یا پہلی بار آسٹریلیا آئے ہیں۔" ڈرائیور اب اس سے اردو بولنے لگا تھا۔

"میں پڑھنے کے لئے آیا ہوں۔ پہلی بار آیا ہوں۔ میرے ایک دوست نے لینے کے لئے آنا تھا۔ لیکن میں دیر سے باہر نکلا تو وہ شاید مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ اس کا فون بھی کٹا ہوا ہے۔ یہ اس کے گھر کا پتہ ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی کو نہیں جانتا۔" سلیم نے جلدی جلدی اسے اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔

"میرا نام چوہدری نور ہے۔ میں بھی پاکستان کا ہوں۔ ملتان کے قریب کا آپ تو یقیناً کراچی کے ہوں گے"۔ ڈرائیور نے اثبات میں سلیم کے ہلتے ہوئے سر کو دیکھے بغیر ہی یقین کر لیا تھا۔ "آپ کو جہاں جانا ہے وہ کیبرامیٹا کا علاقہ ہے۔ اور وہاں کا کرایہ پچاس ساٹھ ڈالر ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے آپ کا دوست اب وہاں نہ رہتا ہو۔"

ڈرائیور کی بات سن کر سلیم کو اپنی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"وہ میرا دوست نہیں ہے۔ دوست کا دوست ہے۔ لیکن پچاس ڈالر تو بہت ہوں گے۔"

سلیم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس نے حساب لگایا تھا کہ پچاس ساٹھ ڈالر میں تو اس کے دو ہفتوں کے کھانے پینے کا خرچ چل سکتا تھا۔

"جی ہاں۔ اسی لئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ آپ پڑھنے کے لئے آئے ہیں یا نوکری کے لئے۔" چودھری نور نے پوچھا۔

"پڑھنے کے لئے۔ میں انجینئر ہوں اور اسکالرشپ پہ ماسٹرز کرنے آیا ہوں۔"

سلیم نے بتایا۔

"دیکھئے کیمبرا پہنچنے کے لئے سب سے آسان ذریعہ ٹرین ہے۔ آپ صرف ڈھائی ڈالر میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔" ٹیکسی اب اس جنکشن پر پہنچ گئی تھی جہاں سے کیمبرا جانے کے لئے بائیں طرف اور شہر کے دائیں طرف مڑنا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ مجھے ٹرین اسٹیشن پر پہنچا دیں۔ میں ٹرین پکڑ کر پوچھتا پوچھتا چلا جاؤں گا۔"

ٹیکسی شہر کی طرف دوڑنے لگی۔ رستے بھر دونوں ایک دوسرے سے اپنا ابتدائی تعارف کراتے رہے۔ ساتھ ہی سلیم گزرتے ہوئے شہر کو دیکھ کر سڈنی سے اپنا ابتدائی تعارف حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی تک اسے کوئی ایسا منظر نظر نہیں آیا تھا جو اسے سڈنی کے بارے میں کوئی خاص تاثر قائم کرنے میں مدد دیتا۔ منصوبہ بندی سے بنے ہوئے کسی بھی شہر کی طرح ہر طرف سیمنٹ پھیلا ہوا تھا۔ سیمنٹ کی سڑک، سیمنٹ کی دو طرفہ فٹ پاتھیں۔ مکانوں کی قطاریں، جن میں کہیں کہیں سے سبزہ جھانکتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہر تھوڑے فاصلے پر دکانوں، ریسٹورانوں یا دفاتر کا سلسلہ۔ بہت قاعدے سے چلتا ہوا ٹریفک لیکن سلیم کو حیرت تھی کہ اسے ابھی تک کوئی پولیس والا نظر نہیں آیا تھا۔ نہ سڑک پر نہ کسی ٹریفک چوراہے پر۔ ایئرپورٹ پر بھی جہاں اس نے باہر کھڑے ہو کر اتنے گھنٹے گزارے تھے وہاں کوئی وردی والا نظر نہیں آیا تھا۔ ہر چیز کسی خود کار نظام کی طرح چل رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور سلیم کو بتا رہا تھا کہ یہ راستہ شہر کے تجارتی مرکز کی طرف جاتا ہے جہاں اونچی عمارتوں کا

ایک جنگل ہے۔ ٹریفک جام، فٹ پاتھ پر چلنے والوں کا رش۔ خریداروں کا ہجوم، بہت بے صبری سے بھاگتے ہوئے لوگ جیسے ان کے رکتے ہی دنیا کی گردش تھم جائے گی۔ اس لئے وہ اس حصے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے سینٹرل ریلوے اسٹیشن پر اتار دے گا جہاں سے اسے کیبرا اینا کی ٹرین مل جائے گی۔

سینٹرل اسٹیشن کی منزل آنے سے کچھ دیر پہلے چوہدری انور نے کچھ سوچا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے خدشات سے سلیم کو آگاہ کر دے، لیکن ساتھ ہی وہ سوچ رہا تھا کہ اسے خدشات ہی نہیں ان کا حل بھی بتانا ہوگا۔ اسے معلوم تھا کہ سدنی آنے والے اپنے اس ہم وطن اجنبی کو اس وقت اتار کر چلا گیا تو یہ بے ٹھکانہ نوجوان کیبرا اینا میں بھٹکتا ہوا کسی دشواری میں پھنس سکتا ہے۔ تھوڑی دیر اپنی سوچوں سے بحث کر کے انور نے فیصلہ کیا کہ اسے سلیم کو اپنے خدشات سے آگاہ کر دینا چاہئے۔

"کیبرا اینا کا علاقہ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ آپ بالکل نئے ہیں۔ آپ کو ہر قدم پر اپنے اگلے قدم کے بارے میں پوچھنا پڑے گا۔ کیبرا اینا میں منشیات کے عادی گروہ آپ جیسے انجانے لوگوں کی تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔ آپ ان سے بچ کر اپنے پتے پر پہنچ بھی گئے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کا دوست وہاں نہیں ہوگا۔ یہاں بل نہ دینے پر فون اتنی جلدی نہیں کٹتے۔ اسی صورت میں کٹتے ہیں جب آپ وہاں سے کہیں اور جا چکے ہوں۔ کیبرا اینا میں آپ بالکل بے یار و مددگار ہوں گے۔"

"میں کسی ہوٹل میں چلا جاؤں گا۔" سلیم نے مسئلے کا حل نکالا۔

"میں آپ کو کیبرا اینا کے ہوٹل میں ٹھہرنے کا مشورہ بھی نہیں دوں گا۔ آپ کو ہوٹل میں رکنا ہے تو یہاں کوئی سستا ہوٹل تلاش کر لیں۔ کیبرا اینا تک کی دوڑ لگانا بے سود ہے۔ پچاس ڈالر میں

آپ کو ایک مناسب کمرہ مل جائے گا۔ پھر ایک ہی رات کی تو بات ہے۔" چوہدری انور نے سلیم کو سمجھایا۔

"ایک نہیں تین راتوں کی بات ہے۔ میری یونیورسٹی پیر کو کھلے گی۔ اور پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یونیورسٹی کھلتے ہی وہاں میری رہائش کا انتظام ہو جائے۔ میرا بجٹ ایسا نہیں ہے کہ میں اتنی دیر ہوٹل میں ٹھہر سکوں۔" سلیم نے اپنی تشویش بتائی۔

چوہدری انور کو اندازہ تھا کہ اسکالرشپ پر آنے والے کتنے تنگ بجٹ میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اسے اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ وہ خود عارضی طور پر ایک چینی فیملی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اسے آخر ایک حل سوجھ ہی گیا۔

"آپ کو میں سرے علاقے کی مسجد میں اتار دیتا ہوں۔ یہاں سامنے کی ایک گلی میں واقع پاکستانیوں کی مسجد ہے۔ پیش امام کو میں جانتا ہوں، آپ کچھ دن وہاں رہ سکتے ہیں۔ اتوار کو میں چھٹی کرتا ہوں۔ اس دن دوپہر کو آکر آپ کو کیمبرا لیجا لے جاؤں گا۔ آپ اپنے دوست کو بھی تلاش کر لیجئے گا۔ وہ نہیں ملا تب بھی آپ اس وقت تک مسجد میں رہ سکتے ہیں، جب تک یونیورسٹی والے آپ کے لئے ہوسٹل کا بندوبست نہ کر دیں۔"

سلیم نے صرف خاموشی سے سر ہلا دیا۔ موجودہ حالات میں اس کے مسائل کا اس سے بہتر حل ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ خوب زور زور سے روئے۔ بے وطنی کے پہلے چند گھنٹے ہی اس کے لئے عذاب ثابت ہوئے تھے۔ ہر قدم پر ایک نئی مشکل ایک نئی رکاوٹ جس کا اختتام اب ایک مسجد میں ہو رہا تھا جہاں وہ ایک بے سہارا بے یار و مددگار اور بے گھر مسافر کی طرح رہے گا۔ فاقہ کے لئے آیا ہوا کھانا کھائے گا اور جہاں نماز پڑھنے کے لئے آنے والے نمازی اسے دیکھ کر ترس کھایا کریں گے۔ اس کی ماں کو اگر معلوم ہو گیا تو اس کا کلیجہ کٹ جائے گا۔ وہ امیر لوگ تو نہیں تھے لیکن سلیم اپنے ماں باپ کی ایک ہی

ادا ہو تھا، جنہوں نے اسے پھولوں کی طرح پالا تھا۔ دو سال پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا جس کے بعد اپنی ماں کے لئے وہ ایک بار پھر سے بچہ بن گیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ سڈنی میں اس کا یہ استقبال ہوا ہے تو وہ اس کی فوری واپسی پر اصرار کرے گی، ایک دن یہاں نہیں رہنے دے گی۔

سلیم کو ایک ہفتے تک مسجد میں رہنا پڑا۔ لیکن ایک ہی دن میں وہاں رہنے کے بارے میں اس کا یہ نفسیاتی مسئلہ ختم ہو گیا تھا کہ سڈنی کی اس مسجد میں رہنا کوئی فقیرانہ کام ہے۔ پردیس کی یہ مسجد نئے آنے والے غیر ملکی مسلمانوں کے لئے جن کے پاس رہنے کا فوری انتظام نہیں تھا پناہ حاصل کرنے کا ایک ایسا ذریعہ تھی جس میں انا مجروح ہونے یا سماجی رتبہ گھٹنے کا احساس تک نہیں تھا۔ سلیم مسجد میں رہنے کے تکلیف دہ احساس کو جھٹکنے میں اس لئے بھی کامیاب ہو سکا تھا کہ اس کی سی صورت حال کے دو اور لڑکے یہاں رہ رہے تھے۔ مسجد میں رہنا یہاں مستقل آنے والوں سے تعلقات پیدا کرنے کا ذریعہ بھی تھا۔ دن میں تو کم لوگ مسجد آتے تھے لیکن مغرب اور عشاء کی نمازوں میں تعداد زیادہ ہوتی۔ ایک مستقل گروپ مغرب کے بعد عشاء تک پیش امام کے ساتھ بیٹھ کر مختلف مسائل پر بات چیت کرتا تھا۔ سلیم کو کسی نے بتایا یہ تبلیغی جماعت والے تھے جو جماعتیں تشکیل دے کر آسٹریلیا کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کرنے جاتے تھے۔ ان میں سے فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ایک وکیل تھے۔ ایک چھوٹے دبلے لیکن لمبے قد والے ہزارہ کے تھے جن کی گراسری کی دکان تھی۔ گھنی سیاہ داڑھی والا ایک نوجوان بنگلہ دیش سے آیا ہوا ڈاکٹر تھا جو آسٹریلیا میں میڈیکل پریکٹس کرنے کے لئے امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

آسٹریلیا میں سب سے خوشحال پاکستانی طبقہ ڈاکٹروں کا تھا۔ ان میں سے کئی بڑی پابندی سے عشاء کی نماز پڑھنے آتے۔ بہت ملنسار خوش اخلاق سے پیش آنے والے لوگ۔

لیکن مدد کرنے کے لئے آگے بڑھنے کا فرض ان لوگوں نے اپنے سر لیا ہوا تھا جو ایک معاشی
جنگ جیتنے کے لئے گھر بار اور کنبوں کو چھوڑ کر یہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ دن دن بھر
فیکٹریوں میں کام کرتے یا رات رات بھر ٹیکسیاں چلاتے اور ایک فلیٹ میں تین تین چار چار
مل کر رہتے۔ مسجد کے آس پاس کے علاقے میں اس طرح کے کئی لوگ تھے جن میں سے
منظر اور ظہیر نامی لڑکوں کو سلیم اچھی طرح جان گیا تھا۔ اتوار کی رات وہ سلیم کو اپنے فلیٹ لے
گئے تھے، جسے وہ ڈیرہ کہتے۔ یہاں آس پاس رہنے والے ان کے اور دوست بھی جمع تھے
اکٹھا کھانا کھانے کے بعد وہ رات گئے تک المونیم کے الٹے تسلے پر سنگت کرتے اور اونچی آوازوں
میں پنجابی گیت الاپتے رہے۔ سلیم کو ان میں سے کسی کی آنکھ میں ماضی کے دکھوں کی راکھ نظر
نہیں آئی۔ کسی کے چہرے پر پیچھے چھوڑے ہوئے اپنے پیاروں کی جدائی کے احساس کا سایہ
نظر نہیں آیا۔ وہ صرف اس وقت گزارے جانے والے لمحے کی خوشیوں میں مگن تھے۔ ان کی
آنکھوں چہروں اور جسم کی ہر جنبش میں بے تحاشا توانائی تھی۔ کبھی نہ تھکنے والا جوش و خروش
۔ بے فکروں کی اس محفل میں صرف سلیم فکر مند تھا۔ جو یہ سوچ رہا تھا کہ شور سے تنگ آئے
ہوئے پڑوسیوں کی شکایت پر پولیس کب آتی ہے۔

چوہدری انور اس دعوت میں سلیم کے ساتھ شریک تھا۔ چوہدری ان لڑکوں میں
سے بیشتر کو جانتا تھا اور ملانے میں ان سب کا شریک تھا۔ اپنے وعدے کے مطابق وہ دوپہر
کو سلیم کے پاس آیا تھا اور اسے کیبرا یجانے کر گیا تھا۔ انور کا یقین بالکل درست تھا، اس پتے پر
بشیر احمد نہیں رہتا تھا بلکہ کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ دیر تک گھنٹی بجاتے رہے، پڑوس کا دروازہ
کھٹکھٹایا تو ایشیائی شکل کی ایک چینی یا ویت نامی عورت باہر نکل کر آئی۔ اسے انگریزی نہیں آتی
تھی۔ انہوں نے برابر کے فلیٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھنا چاہا تو وہ بڑی تیزی سے دروازہ بند
کر کے اندر چلی گئی۔ دونوں بوڑھی عورت کے اس ردعمل پر حیران ہوتے ہوئے عمارت سے

باہر نکل آئے۔ چوہدری انور نے سلیم سے وعدہ کیا کہ وہ بشیر احمد کے بارے میں پتہ لگائے گا۔ لیکن سلیم کو اب بشیر احمد میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس نے بشیر کو دیکھا تھا، وہ اسے جانتا تھا۔ اسے تو صرف پہلے چند دنوں کے لئے بشیر احمد کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت اب مسجد میں رہ کر پوری ہو گئی تھی۔ سلیم نے سوچا یہ اس کے لئے بہتری ہوا تھا۔ چوہدری انور کی شکل میں وہ کوئی فرشتہ تھا جس نے اسے کیمبرا جیسے علاقے میں بھٹکنے یا کسی انجانے شخص کے ساتھ رہنے سے بچا لیا تھا اور ایک پاکیزہ ماحول میں اس کے ابتدائی مشکل دنوں کا انتظام کر دیا تھا۔

سلیم کو سڈنی آئے ہوئے چھ مہینے ہو گئے تھے اور وہ ابتدائی دنوں کی جہم جوئیوں سے فارغ ہو کر یونیورسٹی کے ماحول میں پوری طرح رچ بس گیا تھا۔ رچ بس جانے میں اسے دشواری اس لئے بھی پیش نہیں آئی تھی کہ سماجی اور ثقافتی طور پر اس نے خود کو الگ تھلگ رکھا تھا اور تمام توجہ اپنی ریسرچ پر مرکوز کر دی تھی۔ وہ شام گئے تک تجربوں اور کتابوں میں غرق رہتا۔ اس نے تہیہ کیا تھا کہ دو سال سے پہلے اپنی ریسرچ مکمل کر کے واپس چلا جائے گا۔ اس کی رہائش یونیورسٹی سے دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ یہ جگہ حاصل کرنے میں یونیورسٹی اس کی زیادہ مدد نہیں کر سکی تھی۔

یونیورسٹی کے ہوسٹل مہنگے اور اس کا بجٹ محدود تھا۔ کسی کے ساتھ مل کر رہنے کے لئے یونیورسٹی بھر میں جو نوٹس لگے ہوئے تھے وہ زیادہ تر آسٹریلوی یا یورپی نوجوان لڑکوں کے تھے جن کے ساتھ رہنے کی سلیم میں ہمت نہیں تھی۔ ایک فلیٹ اسے پسند بھی آیا۔ ایک صاف ستھرا چھوٹا سا علیحدہ کمرہ چالیس ڈالر ہفتے میں مل رہا تھا۔ یونیورسٹی کے بالکل سامنے کی عمارت کے ایک فلیٹ میں تھا۔ لیکن اس کی مکین سنہرے بالوں والی ایک بہت خوبصورت سی لڑکی تھی جو انگریزی ادب میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ اس کی شرائط زیادہ مشکل نہیں تھیں۔ ایک شرط یہ تھی کہ وہ پیر سے جمعہ تک کام کے پانچ دنوں میں اپنی کسی گرل فرینڈ کو نہیں

لا سکتا، صرف ویک اینڈ پر پا سکتا ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ اس کا اپنا بوائے فرینڈ بھی جو سڈنی سے باہر رہتا ہے ویک اینڈ آ کر اس کے ساتھ گزارتا ہے۔ لڑکی اپنی بلی کو گود میں لیے سلیم کو فلیٹ دکھانے کے دوران مستقل بولے جا رہی تھی۔ اس نے یہ بھی پیش کش کی کہ ویک اینڈ پر سلیم اور اس کی گرل فرینڈ اگر مصالحے دار کھانا پکائیں تو وائن وہ لے آئے گی۔ موم بتیوں کی روشنی میں ڈنر کریں گے۔ یا دوپہر کو بیئر پی کر بار بی کیو کریں گے۔ اس طرح باہر جا کر پیسہ خرچ کئے بغیر وہ اپنے گھر میں جشن منائیں گے۔ اس معصوم سی لڑکی نے فرض کر لیا تھا کہ سارے سماج اس کی اپنی مغربی قدروں والے سماج ہیں جن میں گرل فرینڈ بوائے فرینڈ بیئر اور وائن زندگی کے لازمی جزو ہیں۔

سلیم اسے یہ بتا کر حیرت زدہ یا اس کے سامنے خود کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے نہ وہ شراب کا عادی ہے۔ لڑکی نے اپنا نام "ایوان" بتایا تھا۔ وہ کافی بنانے جا رہی تھی اور یہ فرض کر کے سلیم بھی کافی پیتا ہوگا اس سے پوچھنے لگی کہ وہ کافی کس طرح پیتا ہے "وہائٹ ود نو شوگر" کہتے ہوئے سلیم بھی منع نہیں کر سکا۔ کافی کا پاٹ پہلے ہی گرم تھا، وہ دودھ چینی ڈال کر فوراً ہی لے آئی۔ اس تمام عرصے میں بلی اس کی گود میں رہی تھی۔ کافی پیتے ہوئے وہ مستقل باتیں کرتی رہی۔ زیادہ تر اپنے بوائے فرینڈ کی جو میوزیشن تھا اور سڈنی سے باہر کی ایک ساحلی تفریح گاہ پر واقع ہوٹل کے بار میں پیانو بجاتا تھا۔ باتوں کے دوران وہ بار بار ہنس پڑتی تو اس کے چھوٹے سے دہانے کی قید سے باہر نکل کر چمکتے ہوئے موتیوں جیسے دانت اور گالوں میں پڑتے ہوئے خفیف سے گڑھے بہت اچھے لگتے۔ سلیم کو یہ عجیب سا احساس بھی ہوا کہ "ایوان" اور بلی کی آنکھیں ایک سی تھیں۔ رنگ تو بالکل ایک سا تھا۔ ہلکا ہلکا سبز رنگ جو شاید جذبوں کی شدت یا روشنی کے زاویے بدلنے سے جگنوں لگنے لگتا تھا لیکن بلی کی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ سلیم کو گھورتی ہوئی یہ آنکھیں اپنے جسم پر پیوست

محسوس ہوئیں۔ ان آنکھوں پر ایک موٹا اور شفاف سا شیشہ چڑھا ہوا نظر آتا تھا جیسے اس نے موٹے موٹے شیشوں والے کنٹیکٹ لینس لگائے ہوئے ہوں۔ جب کہ ایوان کی آنکھوں پر ہلکے سے پردے کی طرح خوابوں کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ایوان کی گفتگو کا مرکز اس کا بوائے فرینڈ ڈیوڈ تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ تعلیم مکمل کرتے ہی دونوں شادی کر کے ایک طویل ہنی مون پر یورپ چلے جائیں گے۔ اور شاید وہیں کہیں رہ بھی جائیں۔

سلیم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اسے بتائے کہ وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ اس کے پاس منع کرنے کا کوئی معقول جواز نہیں تھا۔ اسے ایوان پسند آئی تھی۔ معصوم اور سادہ دل جس کی زندگی پر شاید غم کا کوئی سایہ نہیں پڑا تھا۔ دوسروں کو اپنی طرح صاف دل اور سچا سمجھنے والی لیکن سلیم کو بلی اور ایوان کی سبز آنکھوں کی جوڑی سے ایک خوف سا محسوس ہوا۔ ایک لڑکی کے ساتھ رہنا اس کے لئے ایک ناقابل قیاس عمل تھا۔ وہ کس کس کو سمجھائے گا۔ پھر ویک اینڈ پر ہفتے بھر کی جدائی کا حساب چکاتا ہوا وصل کی کیفیتوں میں مبتلا یہ جوڑا اس کی توجہ کو بار بار بھٹکائے گا۔ سلیم ایوان اور اس کے بوائے فرینڈ سے زیادہ ان کی بلی سے خوف زدہ تھا۔ بلی کی آنکھوں میں اسے کینہ توزی کی جھلک نظر آئی تھی۔ ایوان نے اسے بتایا تھا کہ اس بلی کو چھ مہینے پہلے اس کا بوائے فرینڈ کہیں سے لایا تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک مہینے کی تھی۔ ایوان نے اسے ہنس کر بتایا کہ ویک اینڈ پر جب ڈیوڈ آتا ہے تو مجریا اس سے چپک جاتی ہے ایوان کے پاس پھٹکتی بھی نہیں ہے۔ سلیم کافی ختم کر چکا تھا۔ وہ ایوان سے یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ اسے ابھی ایک اور فلیٹ دیکھنے جانا ہے اس نے اگر ایوان کا فلیٹ لینے کا فیصلہ کیا تو وہ اسے فون کرے گا اگر اسے کل تک فون نہیں ملا تو وہ پھر سمجھ لے کہ اس نے دوسرا کمرہ لے لیا ہے۔ سلیم کو ایسا لگا جیسے ایوان کو معلوم ہے کہ وہ فون نہیں کرے گا۔ وہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر نکل آیا۔

سلیم کو ایک ہفتے کی تگ و دو کے بعد یونیورسٹی کے نزدیک کوجی کے علاقے میں رہنے کی جگہ مل گئی تھی۔ یہ جگہ بھی اسے ایک مسجد کے توسط سے مل گئی تھی۔ غیر ملکی طلبہ کی مدد کے لئے یونیورسٹی کا جو ڈیپارٹمنٹ تھا اس نے سلیم کو اس کے علاقے سے تعلق رکھنے والی سوسائٹیوں کے پتے دیئے تھے۔ یونیورسٹی کی پاکستان سوسائٹی کے صدر کا جو نمبر دیا گیا تھا اس پر کئی بار فون کئے لیکن رابطہ نہ ہوسکا۔ ایک نمبر اسلامی سوسائٹی کا تھا اس پر ملنے والے نے اسے نماز کے وقت یونیورسٹی کی مسجد آنے کے لئے کہا۔

سلیم مغرب کی نماز یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کرنے گیا تو وہاں احمد بھی نماز میں شریک تھا جس کے پاس رہنے کی جگہ تھی۔ احمد اپنے ساتھ سلیم کو فلیٹ دکھانے لے گیا اور ساتھ ہی اس نے وہاں کا بجٹ اور رہنے کی شرائط بتائیں۔ کھانا مشترکہ طور پر تینوں باری باری پکائیں گے۔ برتن دھونے اور فلیٹ صاف کرنے کی بھی باری تھی۔ صابن، ٹوتھ پیسٹ اور صفائی کے سامان سمیت کھانا پکانے کا تمام سامان مشترکہ طور پر خریدا جاتا تھا۔ فون کے لئے صرف مقامی کالوں کا کنکشن لیا گیا تھا، فلیٹ کا کرایہ 120ڈالر تھا یعنی چالیس ڈالر فی کس، گراسری، بجلی اور فون کا خرچ بانٹنے کے بعد تیس سے چالیس ڈالر فی کس کا اوسط آتا تھا۔ سلیم کے لئے حساب کتاب بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا بجٹ سو ڈالر ہفتے کا تھا۔ اس کے رہنے اور کھانے پینے کے تمام اخراجات کے بعد بھی اس کے پاس دوسرے خرچوں کے لئے بیس تیس ڈالر بچ جاتے۔ سلیم کو ہر چیز ٹھیک اور اپنی ضرورت اور بجٹ کے مطابق لگی۔ احمد کے ہاں کہنے پر وہ دوسرے ہی روز سرے ہلز سے اپنا سامان لے کر فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔

سلیم کی زندگی چند ہی دنوں میں اپنے ڈھب پر آگئی۔ اپنے رہنے کا یہ انتظام اسے اس لئے بھی اچھا لگا تھا کہ اسے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے نوکری کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ نوکری کرنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا وہ محنت کرنے کا عادی تھا۔ نوکری ملنا کوئی

مسئلہ بھی نہیں تھا۔ سرے بڑ میں تبلیغی جماعت والے خان صاحب نے جن کی کریانہ کی دکان تھی اسے پیش کش کی تھی کہ وہ اسے ہفتے میں چند گھنٹے کا کام دے سکتے ہیں۔ ایسی ہی پیش کش وکالت کرنے والے مولانا نے بھی کی تھی جو اسے اپنے استقبالیہ کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ وہ دری پیشن پر کسی نامحرم لڑکی کو رکھنے کے قائل نہیں تھے اور کہتے تھے کہ لڑکیوں کی مسکراہٹ دکھا کر کاروبار کرنے کو حرام سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے دفتر میں ری سیپشن پر اکثر داڑھی والے لڑکے دکھائی دیتے تھے۔ جن کا تعلق ان کی تبلیغی جماعت سے ہوتا تھا اس میں دونوں کا فائدہ تھا۔ وکیل کو کم پیسوں میں زیادہ محنت کرنے والے کارکن مل جاتے، ان کی آخرت بھی سنورتی رہتی اور ساتھ ہی لڑکوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ نکل آتا جو پڑھائی جاری رکھنے کے لئے بہت ضروری تھا۔ سلیم نوکریاں کرنے کے بجائے تمام وقت اپنی ریسرچ پر لگا کر کم از کم چھ مہینے بچا سکتا تھا۔ پھر ایک دفعہ کمائی شروع کرنے کے بعد ڈالروں کی لالچ ایک نہ ختم ہونے والا چکر شروع کر سکتی تھی۔

اصغر ندیم سید-(-1950)

تاریخی شہر ملتان سے تعلق رکھنے والے اصغر ندیم سید ایک ہمہ جہت ادیب ہیں۔ ان کی شہرت بنیادی طور پر ایک شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار، کالم نگار اور استاد کی ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ افسانوں کی ایک کتاب اور ایک ناولٹ "آدھے چاند کی رات" چھپ کر سامنے آ چکے ہیں۔ ان کا شمار ٹی وی کے مقبول ترین لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ان کے کئی ڈرامہ سیریلز بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ بحیثیت ڈراما نگار وہ متعدد ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں۔ انھیں صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

چند برس قبل ان کا پہلا ناول "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" شائع ہوا اور رواں برس ان کا دوسرا ناول "دشتِ امکاں" چھپ کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اس انتخاب میں ان کے پہلے ناول "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" کے چند صفحات شامل کیے گئے ہیں۔

'ٹوٹی ہوئی طناب ادھر' ایک مٹتے ہوئے شہر کی داستان ہے۔ ناول میں بیان کیے گئے حوالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ شہر ملتان کی کہانی ہے اور یہاں کے قدیم گھرانوں، خانقاہوں کے وارثوں، جاگیردار خانوادوں کی ذاتی زندگیوں کے قصے اور شہر کی روایات و ثقافت کے ہمہ جہت پہلو آشکار کرتی ہے۔ کہانی کے کرداروں کی باہمی جڑت، سماجی طاقت اور جنسی تعلقات کا باہمی میل میلاپ اس کا بنیادی موضوع ہے جس پر اس معاشرے کی بنیادیں استوار ہیں۔

تقدیس اور تحریص کا ایک دوسرے کو قوت دیتا ہوا تعلق اس ناول کے کرداروں اور واقعات کی سب سے مضبوط لڑی ہے۔ جس کے گرد بدلتی ہوئی سماجی اور معاشی زندگی،

اخلاقی اقدار، طاقت کے بدلتے توازن، اور پُراسراریت کی تہیں بند ہوتی اور کُھلتی ہیں۔ شہری زندگی سے جڑی ہوئی مگر متوازی چلتی ہوئی روہی کی صحرائی زندگی بھی اس کہانی کا ایک اہم جزو ہے۔ سرائیکی سماج، شاعری اور داستانوں میں روہی اور چولستان کا علاقہ رومانس کا استعارہ رہا ہے۔

خواجہ غلام فرید کی بہت سی کافیوں میں اسی علاقے کے موسموں، پیلو چننے کے گیت اور نازک حسیناؤں کے ذکر سے عبارت ہے۔ یہ زمان سے آگے پھیلے ہوئے صحرا اور آبادیوں میں سرگوشیاں کرتی ہوئی خاموشی اور اس کے پہلو بہ پہلو وقوع پذیر ہوتے میلوں اور ان میں جنم لیتی کہانیاں ان استعاروں سے بیان ہوتی ہیں جو اس علاقے کے لوگوں میں سینہ بسینہ وقت کے دھاروں پر رواں دواں رہے ہیں۔ اور لوگ کبھی ان سے غافل نہیں ہوتے۔ ناول میں ان داستانوں کو بہت خوبصورتی سے سمویا گیا ہے اور کہانی کے مرکزی بیان کا حصہ بنایا گیا ہے۔

گمشدہ تہذیبوں اور مٹتی ہوئی بستیوں کی داستان اردو فکشن کا ایک مقبول موضوع رہا ہے۔ نوآبادیاتی نظام اور اس کے بعد تیز رفتار سائنسی ترقی اور معاشی ترقی کے اثرات نے جس طرح قدیم اور ٹھہرے ہوئے معاشروں، شہروں اور تمدن کے مراکز پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں، ٹوٹی ہوئی حسب نو عمرانی اقدار کا احوال بیان کرتا ہے۔ ناول کی کہانی ملتان، بہاولپور اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں کی خانقاہی زندگی کے گرد رواں دواں معاشرت کی رنگا رنگ پرتیں کھولتا ہے۔

ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر

سالِ اشاعت: 2019

اصغر ندیم سید

بہت عجیب آدمی تھا وہ۔ اس کے دماغ میں دماغ نہیں تھا۔ تاریخ کا گھونسلہ تھا۔ وہ کوئی مورخ نہیں تھا۔ اس نے کسی کالج یا یونیورسٹی کا دروازہ نہیں دیکھا تھا لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تاریخ میں اترنے کے لئے اس قسم کا تردد کیا جائے۔ تو پھر تاریخ اس کے دماغ سے شریانوں میں گھس گئی۔ سوال یہ کہ کون سی تاریخ؟

وہ بہت ہی پرانے شہر میں پیدا ہوا تھا۔ پرانے شہر کیا ہو سکتے ہیں؟

جیسے دمشق، بغداد، روم، تاشقند، شاید ان سب سے بھی پرانا ہو۔ پرانا شہر نئے شہر میں گم ہو جاتا ہے۔ نہیں نہیں نیا شہر پرانے شہر میں دکھائی نہیں دیتا یا اپنا الگ سے اظہار نہیں کر پاتا اور سکہ پرانے ہی شہر کا چلتا رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک شہر تھا جہاں منشی امام بخش ایک تنگ گلی سے جڑی ہوئی دس گلیوں کے درمیان ایک چوبارے کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ کمرہ کتابوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ کتابوں ہی پر سر رکھ کے سوتا تھا۔ شہر کے پڑھے لکھے جو شہر کی آبادی کے حساب سے اسی فیصد تو ہوں گے کہ پرانا شہر پڑھے لکھوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وجہ تو ایک ہی ہو سکتی ہے کہ پرانے شہر کی جڑوں میں صدیوں نے بسیرا کیا ہوا ہوتا ہے اور صدیاں اپنا معنی چھپا کے نہیں رکھتیں۔ وہ معنی تو منتقل ہوتا ہے۔ بہر حال شہر کے پڑھے لکھوں نے منشی امام بخش کو علامہ منشی امام بخش کا نام دیا تھا۔ منشی نے اس کے علامہ ہونے کو کبھی جتایا نہیں تھا۔ اس لئے کہ منشی پرانے شہروں میں محض کھاتے کھتونیاں لکھنے کے لئے نہیں ہوتا تھا۔ منشی کا رتبہ اس سے کچھ بڑھ کے تھا کہ وہ انتظامی امور میں بھی خود کو ظاہر کرتا تھا اور اس کو اس لئے

منشی حق بھی کہا جاتا تھا اور وہ جاگیرداروں کی ناک کا بال سمجھا جاتا تھا لیکن علامہ منشی امام بخش بس لکھنے کی وجہ سے منشی تھا ورنہ تو وہ بس تاریخ کے اندر سانس لیتا تھا یا تاریخ اس کے اندر زندہ تھی۔ منشی علامہ نہ بھی بنتا تو امام بخش تو وہ تھا ہی۔ اس کا تاریخی شہر کمال کا تھا۔ صدیوں کو صدیوں میں ملائیں تو تب یہ شہر اجاگر ہوتا تھا۔

ایک اونچے ٹیلے پر قلعہ بنایا گیا تھا کسی وقت شہر کو افغانیوں کی یلغاروں سے بچانے کے لئے اور آس پاس کے راجوں اور نوابوں کی مقامی سطح پر بدمعاشیوں کو قابو میں لانے کے لئے۔ اس قلعے کے نیچے ساتھ شہر تھا۔ اس میں باؤلیاں تھیں، کنڑیاں تھیں، گلی در گلی محلہ جات تھے۔ ہر محلے میں مکانوں کی قطاریں تھیں۔ ہر مکان نیچے سے اوپر تک جاتا تھا۔ یہ لگتا ہے کہ ٹاؤن پلاننگ کی معراج ہو گا کہ زمین کے رقبے کو بچایا جائے اور آبادی کو نیچے سے اوپر منتقل کیا جائے۔ اس لئے لاتعداد جھروکے، چوبارے، چھتوں پر ممٹیاں اور ممٹیوں پر کبوتروں کی چھتریاں اور کبوتروں کے دل میں محبت اور فقیری۔ اس کے ساتھ ہی ملحقہ مکانوں کی چھتوں پر طرح طرح کی سرگرمیاں ہوتی تھیں جن میں پہلی سرگرمی مسیں پھوٹتے وقت کا عشق اور پھر ادھیڑ عمری کا عشق نما دھوکہ۔ دھوکہ معشوق کے لئے اور عشق نما عشق کی طرف سے ہوتا تھا۔ ان گلیوں کے مکانوں، پھولداریوں، جھروکوں، دالانوں، ڈیوڑھیوں، راہداریوں اور چبوتروں سے گزرتے منشی امام بخش نے جوانی میں قدم رکھتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ تو تاریخ کو بسر کر رہا ہے اور تاریخ کے زمانوں میں ہر جگہ موجود ہے۔ ایسے شہروں میں جوان ہونے کا تجربہ بے حد دلچسپ ہوتا ہے۔ امام بخش خوبصورت تو نہیں تھا کہ اس کے باپ نے کسی افغان پٹھانی سے شادی نہیں کی تھی نہ کسی افغان پٹھان نے امام بخش کی ماں سے شادی کی تھی۔ بس اسی زمین کے اندر سے مٹی کے ناک نقش لے کر پیدا ہوا تھا لیکن پھر بھی ایسے شہر میں جوانی ہی سب سے زیادہ ٹھنٹھناتا ہوا سکہ ہوتا ہے۔ ٹھنٹھنانے سے پہلے کبھی کبھی ٹھنڈا بھی

پڑ جاتا ہے۔ایسا امام بخش کے ساتھ بھی ہوا۔ایک تو گرمیوں کے دنوں میں اندر کی گرمی دماغ پہ
چڑھ دوڑتی ہے اور دوسرا شدید حبس میں چوبارے پر لیٹے ہوئے نیند کے تعاقب میں جسم
بہت بے کل ہو کر بس چارپائی توڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ایسے میں اگر دو تین گز کے فاصلے پر
ساتھ کے چوبارے میں ایسا ہی کوئی جوان جسم خود سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا ہو تو اس کی
چارپائی کی چولیں تو ویسے بھی بولنے لگتی ہیں اور اس شہر کے ہر گھر کی چارپائی کی چولیں اور
ادوائین ڈھیلی ہی رہتی تھیں۔امام بخش کا تہبند بھی ڈھیلا رہنے لگا۔شہر کی سرکاری لائبریریوں
میں دن بھر تاریخ کی دیمک چاٹتے چاٹتے اس کے ہاتھ کچھ ایسے ناول لگ گئے جو سستے بازاری
کاغذوں پر چھپے ہوئے تھے۔نہ اس پر کسی پبلشر کا نام پتہ نہ ہی لکھنے والے کا اتہ پتہ۔البتہ نام اس
لئے درج ہوتا کہ اگر پڑھنے والے کو اس کا نشہ لگ جائے تو وہ اس برانڈ نام پہ بھروسہ کر کے
اس کا دوسرا ناول اچک لے۔نام سب نقلی ہوتے تھے لیکن نقلی یا جعلی نام بھی تو برانڈ نام بن
سکتا ہے۔ضروری نہیں کہ اصلی نام اور اصلی مارکہ ہی برانڈ نام ہو۔اس طرح امام بخش نے وہ
ناول پڑھنے شروع کر دیئے اور کچھ دیر کے لئے تاریخ کی بھول بھلیوں کو فراموش کر دیا۔اب
وہ سرکار کی بنائی ہوئی لائبریری کا کیڑا بن گیا۔ان ناولوں کو پڑھتے ہوئے وہ اکثر خود ہی خود میں
سمٹ جاتا تھا اور سمٹا سمٹایا نکل جاتا تھا۔رات کو چوبارے کی چھت پر اس کے اندر سے جسم کی
پکار بلبلا کر اٹھتی جیسے وہ دبی آگ۔شہر کا اپنا دستور تھا وہاں ایک کوٹھے کی چھت سے دوسرے
کوٹھے کی چھت پر لیٹی کسی بھی جوان لڑکی کی کروٹوں کو گننا معیوب سمجھا جاتا تھا۔حالانکہ بات
صرف کوٹھا پھلانگنے کی تھی اور پھر نہ کسی نے بولنا تھا نہ کوئی بول سکتا تھا کہ جسم کی اپنی آمریت
اور مطلق العنانی بھی تاریخ ہی کا ایک حصہ ہے۔

یہ سب کچھ امام بخش پہ بیت رہا تھا۔وہ بے چارہ تاریخ کے جھروکوں سے نکل کر
کہیں نفسیات اور حیاتیات کی بھول بھلیوں کا مسافر ہو چکا تھا۔اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ باہر کی

دنیا سے خود کو کس طرح وابستہ کرے۔ باہر بساطی کی دکان، قصائی، دھوبی، سبزی فروش، نائی، نانبائی، تندورچی، مٹھائی بنانے والا، خوانچوں پر دال مونگ، چنے اور دہی بھلے بیچنے والے کے ساتھ ساتھ کھوکھوں کی سلسلہ وار دکانیں۔۔۔ ان سے جڑی ہوئی پنساری اور کمہاروں کی دکانیں سب کچھ ہی تھا جو امام بخش کی زندگی کا حصہ تھا لیکن وہ ان سب سے الگ ہو چکا تھا۔
ایسے میں اس نے اپنے ہی محلے کے ایک نوجوان کا ہاتھ پکڑا۔۔۔

مقبول چغتائی محلے میں ایک الگ ہی شہرت رکھتا تھا۔ چغتائی اس لئے تھا کہ اس کے آباؤاجداد سینٹرل ایشیا سے آئے تھے یا نہیں آئے تھے البتہ انہوں نے یہ نام حاصل کر لیا تھا۔ مقبول چغتائی عجب کردار تھا۔ وہ محلے کے تمام نوخیز نوجوانوں کا ہیرو تھا۔ اس کا طریقہ واردات بہت واضح تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ خوش شکل تھا اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے لباس سے کچھ رول ماڈل بننے کی کوشش کرتا تھا۔ مقبول چغتائی کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ گلی کے موڑ پر ایک ٹانگ اٹھا کر دیوار سے لگاتا تھا اور اپنا ایک ہاتھ گردن پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ بے چارے مفلس پیشہ لڑکے اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور وہ اپنی فتوحات کی تفصیل بتاتا تھا۔

مقبول چغتائی قصہ بن جاتا تھا اور اس کا قصہ اس طرح شروع ہوتا تھا کہ وہ جو کالے برقعے میں سکول جاتی ہے، اندر سے بے حد خوبصورت ہے اور جس کی آنکھیں افغانی برقعے سے باہر ابلی پڑتی ہیں وہ تو مرمریں بدن ہے اور اس نے دونوں کو ظلمت میں اس طرح چھپا ہے اور سانسوں میں گم کیا ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ مقبول چغتائی آہستہ آہستہ اپنے محلے کی لڑکیوں کے کپڑے اتارتا تھا اور پھر کپڑے پہناتا نہیں تھا۔ ایسے ہی اپنے کپڑے پہن کر باہر آ جاتا تھا۔ امام بخش اس کے متاثرین میں شامل ہو گیا تھا۔ مقبول چغتائی نے اپنے محلے کے ہر گھر کی جوان لڑکی کو سب کے سامنے بے لباس کر دیا تھا۔ اب امام بخش کے لئے کام آسان ہو گیا۔ وہ صبح نکلتا اور برقعے میں لپٹی ہر لڑکی کو عریاں کر سکتا تھا اور اس کے جسم کے حوالے سے کوئی

بھی زاویہ بنا سکتا تھا۔ اس طرح جب امام بخش گلیوں میں نکلتا اور سامنے آئی ہوئی کوئی بھی عورت غلاف شدہ یا برقعے میں ہوتی تو وہ اپنی پسند کی تصویر بنا لیتا تھا۔ اس طرح وہ ہر برقعہ پوش کو اپنے انداز سے خیال کا روپ دے دیتا۔ اس طرح اس شہر کی ہر عورت اس کے خیال میں عریاں ہو گئی۔

رہی سہی کسر شہر کے حکیموں نے پوری کر دی تھی۔ پورے شہر کے مردوں کو اپنے خطبے اور خاندانی سینہ بہ سینہ صدری نسخوں سے سرکاری سانڈ بننے کی تگ و دو میں رہتے تھے۔ شہر بھر کے مرد درجہ بہ درجہ ان کی فیاضانہ پیشکشوں سے فیض یاب ہوتے ہوئے خضاب پر ہاتھ صاف کرتے اور پھر دل اپنی مردانگی کی آزمائش کے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے۔ خاص طور پر حجاموں کی دکانیں اور گرم حمام ان کی فتوحات کے قصوں کے لیے ہائیڈ پارک کا درجہ رکھتے تھے۔ یہاں انواع و اقسام کے مردوں کا بازار لگتا تھا اور بھر جی بھر کے وہ ایک دوسرے کی حسرتوں کا تماشہ کرتے تھے۔ یہیں کسی وقت میں امام بخش بھی آن دھمکا اور تو اسے اگرچہ شعور نہیں تھا کہ یورپ کی Nude Beaches کیسی ہوتی ہیں لیکن ایسا لگا کہ وہ ایسی جگہ آ گیا ہے جہاں سب کے تہبند تہہ کر کے ایک طرف رکھوا دیئے گئے ہیں۔ امام بخش نے تنشاہی مونچھوں کے نیچے زیر لب مسکراتے ان فاتحین کو دیکھا تو کمر کی ہڈی میں سانپ سرسرا گیا۔ امام بخش کو اب کئی جہاں دیدہ اور موسم چشیدہ صاحب اسرار و رموز نیاں خانۂ جذب و دروں کی خدمات چاہیئے تھیں جو ایک یا دو روپے میں اس کے پکتے چشمے کو ٹھنڈا کر سکے اور عزت کی نقدی بھی بچانے میں معاون ثابت ہو۔ جلد ہی اسے مقبول چغتائی کے توسط سے بلا بانولی والا مل گیا۔ اس کی آنکھیں بلی تھیں اور وہ شہر کے کئی ایسے اڈوں سے واقف تھا جہاں کم پیسوں میں نوآموز شرمیلے نوجوانوں کی عزت کی ضمانت ہوتی تھی۔ یوں تو شہر میں درجہ بدرجہ

کئی چکلے تھے جو چالو حالت میں تھے۔ چالو اس لئے کہ دوسرے شہروں سے آنے والے مسافر راہ چلتوں کو روک کر پوچھ لیا کرتے تھے۔

"بھائی صاحب چکلہ کس طرف کو ہے؟"

اور راہ چلتے معززین پوری ایمانداری سے مسافروں کو سیدھا راستہ دکھا دیتے تھے

"یہ جو اگلا چوک آئے گا وہاں سے دائیں مڑ جائیں تو آگے دو بازار اس میں شامل ہوتے ہیں۔ ایک بازار سیدھا چکلے کو جاتا ہے۔ وہاں کسی سے پوچھ لینا۔"

یہ معلومات ایسے دی جاتی تھیں جیسے کسی نے ضلع کچہری کا راستہ پوچھ لیا ہو۔ یوں تو حکیموں نے شہر بھر کے سکولوں کے بچوں کو شہر کے شکاریوں کے ہاتھوں یرغمال بنا دیا تھا۔ ہر سکول کے آس پاس ایسے عناصر منڈلاتے رہتے تھے اور اپنا نشانہ جلد یا بدیر کسی معصوم کو بنا لیتے تھے۔ شہر میں یہ رواج عام بھی تھا اور اسے بھی فخریہ انداز سے اپنی فتوحات کے زمرے میں شامل کیا جاتا تھا۔ اسی دوران ایک کردار کی شہرت عروج پر پہنچ گئی۔ اس کا نام تو حاجی حیات اللہ تھا لیکن اس نے شہرت "حاجی ایک منٹ" کے نام سے پائی۔ یہ نام ایسے پڑا کہ وہ جب بھی کسی لڑکے کو یہ کہہ کر پکارتا تھا "ذرا ایک منٹ" اگر تو لڑکا رک گیا تو سمجھ لیں شکار ہو گیا نہ رکا تو بچ گیا۔ اس طرح "حاجی ایک منٹ" پورے شہر میں اپنے ہنر کے باعث کو ٹھوں چڑھا اور جب علمائے کرام مجالس میں قوم لوط کا قصہ بار بار سنایا کرتے مگر قصہ سمجھ کر۔

امام بخش کا رجحان "حاجی ایک منٹ" سے کسی بھی طرح کم نہیں ملتا تھا۔ اس نے بلا بانوئی والا کی مدد سے ایک مفلوک الحال آبادی کے ایک کچے گھر پر دستک دی۔

"کون؟"

"وہ یہاں شانو رہتی ہے؟"

"ہاں۔ کون ہو تم؟"

"میں بڑا باتونی ہوں۔۔۔۔وہ ایک لڑکا ہے۔"

"پیسے بتا دیجئے۔"

"ہاں وہ دو روپے اماں سے لے لینا۔"

"پچھلی دفعہ والا دو فلاور ہے یا۔۔"

"پچھلی دفعہ آیا ہے ذرا اُبھر رہا ہے۔ خیال رکھنا۔"

"ہاں وہ بنا بنا کے گود لے لوں گی۔ بھیج دے۔ سب ہی ایسے لاتے ہو جو مجھے گندا کر کے چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی نلکے میں پانی زور لگانے سے آتا ہے۔"

"ہاں بس اب دیکھ لینا۔"

اسی طرح امام بخش کا وہ حال تھا کہ خیالوں میں مقبول چغتائی کی باتیں ہولوں میں تفصیلی منظر نامے اور گرم حماموں کے خضاب آلود جعلی فتوحات کے قصے ایک جھلک میں موحتاج بن کر گزر گئے۔ وہ اندر گیا۔ وہاں شاؤ کے تین مختلف عمروں کے بچے مٹی سے لتھڑے صحن میں کلبلا رہے تھے۔ ایک مٹی کھا رہا تھا۔ ایک ماں سے لپٹا تھا۔ ایک کپڑے کے جھلنگے میں پڑا تھا۔ شاؤ نلکے پر کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا جس سے وہ کپڑوں کو مار مار کے میل نکال رہی تھی۔ اس نے دھوتی باندھ رکھی تھی کہ وہاں یہ آسان اور سستا لباس شمار ہوتا تھا۔ اس کا پورا جسم اور کپڑے پانی سے تر بتر تھے۔ اس نے امام بخش کو دیکھا اور کہا "اندر آ جاؤ۔" امام بخش یہ سب کچھ سمجھ نہ پایا اور اب اسے تو ویسے بھی خیالوں میں طرح طرح کے نقشے یاد تھے۔ یہ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا لیکن اب وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے وہ کمرے میں اس عورت کے پیچھے چلا گیا۔ اس کے تینوں بچوں کا ماں کے جانے کے بعد اپنا اپنا ردِعمل تھا۔ جو بچہ ماں سے لپٹا تھا وہ رونے لگا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ جو اجنبی آیا ہے وہ ماں کے ساتھ کیا کرنے والا ہے یا ماں کی عارضی جدائی نے

اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسی طرح دوسرے بچے نے جو منی کھا رہا تھا حیرت سے منی کھانا ترک کیا اور کمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جھلنگے میں لیٹا بچہ بھی کروٹ لے کر ماں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

امام بخش نے پاجامہ اور قمیص پہنی ہوئی تھی۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا۔ شانو نے پلک جھپکتے میں دھوتی اتار کے پھینکی اور اپنی قمیص جو گیلی تھی اس طرح اتاری کہ گیلے پن کی وجہ سے اتارنے میں جسم کے مختلف حصوں سے چپکی کو اوپر جاتے ہوئے ایک طرح کا ایسا وقت لگا کہ جس میں امام بخش کو ایسا تجربہ ملا کہ اس کے سارے طبق روشن ہو گئے۔ اب ایک محنت کش عورت کا ایسا جسم سامنے تھا جس کے پیٹ میں نان و نفقہ برائے نام آتا تھا۔ اس لئے پیٹ کمر سے لگا ہوا تھا۔ چھاتیاں اگرچہ جسم سے لگی ہوئی تھیں لیکن لمبے قد کی وجہ سے لمبی گردن ہونے کے ناتے ان کی پینٹنگ اچھی بن سکتی تھی۔ امام بخش کے سامنے الف ننگی عورت لیٹ گئی۔ غریب ابھی مشکل سے پاجامہ ہی اتار پایا تھا اور اپنے خیالوں کو مجتمع نہ کر پایا کہ باہر کھڑے "بلا بانوی والا" کے کانوں میں یہ آواز آئی:

"آ جاتے ہیں چھڑکا کرنے۔ گندا لئے۔"

بلا بانوی والا کے لئے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ سب سمجھ گیا کہ وہ تو عرصے سے اسی خدمت پر مامور تھا۔ اب اسے امام بخش کی شکل میں ایک اور تحفہ وصول کرنا تھا۔ سو امام بخش پاجامہ اڑستا ہوا باہر دھکیل دیا گیا اور شانو کی آوازیں پیچھا کرتی رہیں اور وہ دونوں اس مفلوک الحال آبادی سے باہر نکل رہے تھے۔ آوازیں ایک مونتاج بنا رہی تھیں۔

"ماں سے کیوں نہیں۔۔۔ کب سے رکے ہوتے ہیں۔۔۔ انکے پاس کوئی اور طریقہ۔۔۔ کچھ انڈے کی اولادیں۔۔۔ وغیرہ وغیرہ"

امام بخش باہر آیا۔ بلا بانوی والا خاموش تھا اور پھر یہ سارا سفر خاموشی میں گزرا۔

امام بخش جب اس شہر کے چکلوں کی تاریخ دیکھ رہا تھا تو اسے یہ واقعہ یاد آیا۔ امام بخش جو تاریخ میں رہ رہا تھا اسے اپنی تاریخ سے بھی گزرنا تھا اور وہ جب تاریخ سے گزرا تو شہر کے سارے خاندان اس کے سامنے بے نقاب ہو گئے کہ وہ تو ان سب کے شجرہ نسبوں سے واقف ہو گیا۔ یہ ایک عجیب انقلاب تھا جو امام بخش کی زندگی میں آیا اور وہ پھر گیا کہ جو کچھ اس کے ساتھ جوانی میں ہوا وہاں تو چکلوں کو بھی شجرہ نسب تھا۔ وہاں کسی کی بیوی باغی ہو کر بیٹھی۔ کسی کی بیٹی کو وہاں بٹھا دیا گیا اور خاندان خاموش ہو گیا۔ کیوں خاموش ہو گیا؟ کیا بیٹی کو سزا دینا مقصود تھا یا کچھ اور تھا۔ بہرحال امام بخش کا اولین تجربہ اسے چکلوں کی تاریخ کی طرف لے گیا اور طرح طرح کے انکشافات اسے ہوئے۔

منشی علامہ امام بخش عمر کے اب آخری پہر میں قدم رکھ چکا تھا اور شہر بھر کے آوارہ مزاج چڑی سے اترے ہوئے دانشوروں، سیاسی نظریہ بازوں، وکلا، جو وکالت سے زیادہ ادب میں منہ مارتے تھے، غیر حاضر دماغ پروفیسروں، سڑک چھاپ شاعروں اور رات کی آخری شفٹ کے صحافیوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا جو سب کو حسب حال روزانہ شام کو قصے سنانے کے لئے گھر سے نکل پڑتا۔ شہر کے ایک سرے سے آخری سرے تک پھیلے ہوئے قہوہ خانوں، چائے خانوں، ریستورانوں اور پارکوں میں بجی ٹکڑیوں تک پھیرا لگا لیتا۔ آخری پھیرا اس کا آخری شفٹ کے صحافیوں اور رپورٹروں کے چائے خانے کو ہوتا تھا۔ امام بخش چلتی پھرتی تاریخ اور تاریخ سے نکالے گئے قصوں کا سوداگر تھا۔ اپنی جوانی کے اولین تجربے اسے آج چکلوں کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کے لئے شہر کے قہوہ خانوں اور چائے خانوں میں بیٹھنے والے طرح طرح کے کرداروں کے لئے کچھ نئے انکشافات کے لئے آئے یا اور منشی امام بخش نے پہلا پتا سیاسی نظریہ بازوں کے ایک کیفے فیصل شہر میں کیا:

"تمھیں پتہ ہے انسانی سماج میں پہلا چکلہ کب وجود میں آیا؟"

"اب وجود میں آیا؟" ایک ترقی پسندی سے مایوس بابے نے پوچھا۔

"جب پہلی بار ایک عورت نے اپنے سماج سے بغاوت کی۔"

"کیوں بغاوت کی؟"

"اس لئے بغاوت کی کہ وہ ایک سوشل کنٹریکٹ کے تحت ساری زندگی ایک مرد کی غلامی میں آنے کو تیار نہیں تھی جو ہر رات بغیر کسی ادائیگی کے اور اس کی رغبت کا احترام کئے اس کا استحصال کرتا ہے۔"

"اسے کس نے یہ اجازت دے دی۔ قتل کیوں نہ کر دیا۔"

"ہاں اچھا سوال ہے۔ وہ گھر سے بھاگ گئی اور پھر۔۔"

"اور پھر"

"اور پھر اس نے پہلے اپنے عاشق کا پتہ لیا جو اس کا پہلا عشق تھا اور شادی سماج کے اصولوں پر ہوئی تھی۔ عاشق کے ساتھ جنگل میں کئی راتیں گزاریں۔ جنگل مہک اٹھا۔ اس کے بدن کی خوشبو سے پرندوں نے چہچہانا سیکھا۔ پورا جنگل جاگ اٹھا۔ پھول خوشبو دینے لگے۔ کونپلوں نے مہک پھیلائی اور ایک عورت کا جسم کائنات کی آب و ہوا بن گیا۔"

"منشی جمع علامہ امام بخش سیدھی بات بتاؤ، تم تو شاعری کرنے لگے۔" ایک نظریاتی سیاسی کیڑے نے کلبلا کر کہا۔

"سیدھی بات اگر جاننی ہے تو تمہیں داستانوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔"

"وہ کس لئے؟"

"اس لئے کہ داستانیں سارے بھید جانتی ہیں۔ ایسے ہی میں نے تاریخ کو جھنجھا نہیں ڈالا۔" منشی علامہ امام بخش بھڑک گیا تھا۔

"اچھا تو خود ہی بتاؤ کہ چکلے کیسے قائم ہوئے؟"

"اب ذرا غور سے سنو۔"

"اگر غور سے نہ سنیں تو کیا چکر بن جائے گا؟"

"نہیں یار آپ تو مذاق اڑا رہے ہو۔"

"ایسا نہیں ہے آپ کھل کے بات کریں۔"

"کھل کے بات یوں ہے احمد نواز انقلابی کہ تیری بیوی تین بچے چھوڑ کے آخر بھاگ گئی ناں اپنے معشوق کے ساتھ۔ مڑ کے بھی نہیں دیکھا اس نے۔ جگرا چاہیے تین بچے چھوڑنے کے لیے جگرا۔"

"دیکھ امام بخش وہ ٹھیک ہے بھاگ گئی تھی۔ پوچھو کیوں؟"

"پوچھ لیا۔ بولو۔"

"وہ ناں میں نے اس کی طرف کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اگر مکان کو خالی چھوڑ دیا جائے تو اس میں جن بھوت بسیرا کر لیتے ہیں۔ کوئی تو عورت کی تعریف کرنے والا ہونا چاہیے ناں۔ میں جب صبح اٹھتا تو وہ بچے جگا کر دوپہر کا کھانا بنا رہی ہوتی اور جب رات کو آتا تو وہ سو رہی ہوتی تھی، چھوٹے کو سینے سے لگا کے۔"

"اور تجھے تب بھی پتہ نہ چلا کہ وہ بچے کو سینے سے لگا کر کیوں سوتی تھی؟"

"دیکھو امام بخش عرف علامہ مجھے اس کے جانے کا کوئی ارمان نہیں۔ پوچھو کیوں؟"

"بتاؤ کیوں؟"

"وہ اسلئے کہ عورت کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"تمہیں پتہ ہے احمد نواز انقلابی کہ انقلاب اکیلے مرد نہیں لایا کرتے۔ عورتیں بھی اس کا حصہ ہوتی ہیں۔"

"وہ چلی گئی۔ یہ ایک بات ہے۔ تھی وہ بہت ضدی۔ بچوں کو چھوڑ دیا تو مڑ کے نہیں دیکھا۔"

"بس یہی بات احمد نواز انقلابی تجھے بتا رہا تھا کہ داستانوں میں عورتوں کے کردار، مردوں پر حاوی ہیں۔ یاد کرو اندر سبھا کی سبز پری شہزادہ گلفام اس کے سامنے ایک چوپا لگتا ہے۔ کیسے اٹھا کے لاتی ہے اور پھر یاد کرو اس شہزادی کو جو ایک زنگی غلام کو پسند کر کے سارے قاعدے قانون ایک طرف رکھ دیتی ہے اور محل سے اس کے حجرے تک سرنگ بنواتی ہے۔ شام کو وہ اس کے کمرے میں آتا ہے اور پھر فجر کی نماز تک دونوں ناؤ نوش اور بوس و کنار سے ہمکنار ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں امام بخش آگے بتا۔ یہ جو چکلوں کی تاریخ ہے اس میں عورت مرضی سے پیشہ کرتی ہے یا اس سے پیشہ کرایا جاتا ہے۔" ریاض گوریانے پوچھا۔ ریاض گوریا کی بھی ایک کہانی ہے۔ کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے وہ ریاض لکھویرا سے ریاض گوریا ہو گیا۔ چی گویرا کی روح کے ساتھ یہی سلوک ہونا تھا۔

امام بخش نے اس کے سوال کو سنا اور اس کے انقلابی ہونے پر تف کیا کہ وہ جو ساری زندگی استحصالی نظام کی رٹ لگائے ہوئے اپنے ہونے کا احساس رکھتا تھا، اتنی سی بات بھی نہیں جانتا کہ رنڈی یا عورت چکلے میں مرضی سے پیشہ کرتی ہے یا اس سے کرایا جاتا ہے اس پر امام بخش نے پہلے ایک واقعہ سنایا:

"یار تمہارے اس سوال کا جواب میں اپنے ایک واقعے سے دیتا ہوں جو میری زندگی کی یادوں سے بری طرح چپک گیا ہے۔"

احمد نواز انقلابی اس سارے سسپنس کا متحمل نہیں ہو سکا اور بولا "دیکھو امام بخش تم ایسے قصہ گو ہو جو بڑا لالچی ہوتا ہے۔ تو اتو قصہ روکتا ہے۔ سننے والا کا امتحان لیتا ہے اور دیکھ

ہم اپنے الو کے پٹھے نہیں کہ ہمیں پتہ نہیں چلے قصے میں کیا موڑ آئے گا۔ بات سن۔ اب قصوں کے سارے اسرار و رموز کھل چکے ہیں۔ ہم کو چوتیا نہ بنا۔"

"دیکھو چوتیا انسان خود بنتا ہے کوئی اسے بناتا نہیں۔ بہرحال چکلوں اور چیٹے کے حوالے سے جو واقعہ یاد آیا ہے، وہ بے حد اہم ہے۔"

ریاض گوہرانے دلچسپی لے کر کہا "اچھا علامہ اگر واقعہ تیرے اندر آ گیا ہے تو اسے اگل دے۔"

"ہاں تو میں ایک دفعہ ترکی گیا تھا۔ بات مختصر کرتا ہوں کہ کیوں گیا تھا۔"

"ہمیں کئی دفعہ بتا چکے ہو۔ کیوں گئے تھے۔ چکلے کی بات کرو۔"

"ہاں تو پتہ چلا قصہ روکنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ خیر سنو۔ میں انقرہ میں تھا۔ شام کو ایسے ہی میں نے اپنے دوست سے فرمائش کی کہ مجھے یہاں کا چکلہ دیکھنا ہے۔ وہ شک میں آ گیا کہ میرے اندر کوئی فتنہ جاگا ہے، میں نے کہا ایسا نہیں۔ میں چکلوں کی تاریخ پر کام کر رہا ہوں۔ وہ مجھے لے گیا۔ چکلہ یوں سمجھو کہ لاہور کے ریلوے سٹیشن کے آس پاس کا کوئی علاقہ ہوگا۔ ایک پھاٹک لگا تھا جس کے دونوں اطراف دو چھوٹے دروازے کھلے تھے۔ ایک آنے کا ایک جانے کا۔ اس کا مطلب تھا چکلہ کھلا ہے۔"

اکرام اللہ (-1929)

اکرام اللہ برطانوی ہندوستان میں جالندھر کے علاقے جنڈانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈاکٹر تھے اور حکومت پنجاب کے ملازم تھے، اس لیے مختلف شہروں میں ان کے تبادلے ہوتے رہے۔ جس کی وجہ سے اکرام اللہ کو مختلف شہر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تقسیم ہند کے وقت وہ فرسٹ ایئر کے طالب علم تھے۔ ان کے خاندان نے یہ سوچ کر ہجرت کی کہ حالات ٹھیک ہوتے ہی واپس چلے جائیں گے جو بعد میں ممکن نہیں رہا۔ ایمرسن کالج، ملتان سے انہوں نے 1953 میں بی اے آنرز کیا۔ دو برس بعد پنجاب یونیورسٹی لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصہ بطور وکیل پریکٹس کی پھر ملتان میں ایک انشورنس کمپنی سے وابستہ ہو گئے اور 1990 میں بطور اسسٹنٹ منیجر ریٹائر ہوئے۔

ان کے پہلے افسانے کا نام "اتم چند" تھا، جو ادب لطیف میں چھپا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا افسانہ "محتاج" فنون میں شائع ہوا، پھر وہ فنون کے لیے مستقل لکھنے لگے۔ لیکن کچھ عرصے بعد انہیں احساس ہوا کہ مختصر ناول، جسے ہمارے ہاں ناولا یا ناولٹ کہا جاتا ہے، ان کے اظہار کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ چنانچہ پھر کئی ناولٹ لکھے۔ ان کا نام اردو فکشن کا ایک کم معروف لیکن معتبر حوالہ ہے۔ ان کی کتابوں میں، افسانوں کے دو مجموعے "جنگل" اور "بدلتے قالب"، تین افسانوں اور تین ناولٹوں پر مشتمل کتاب "ہلدی گر"، چار ناولٹوں پر مشتمل ایک مجموعہ "سوا نیزے پر سورج"، دو ناول "گرگ شب" اور "سائے کی آواز"، اس کے علاوہ ایک آپ بیتی "جہان گزراں"، شامل ہیں۔ اس انتخاب میں ان کے مشہور ناول "گرگ شب" کے چند صفحات شامل کیے گئے ہیں۔

گرگ شب میں اکرام اللہ محرمات کے جنسی تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کے تہہ در تہہ الجھے ہوئے ذہنی منظر نامے میں اترتے ہیں اور اس اولاد کی ناجائز پیدائش کی وجہ سے اس پر مرتب ہونے والے تباہ کن نفسیاتی اثرات سے جان چھڑانے کی کوششوں اور ان میں ناکامی کا جائزہ لیتے ہیں۔

لگ بھگ ایک سو چھیانوے صفحات کا یہ ناول اپنے اندر وجودی بحران کی ایک المناک داستان چھپائے ہوئے ہے۔ تہہ در تہہ اپنا آپ ظاہر کرتی اس کہانی میں ہمارے آس پاس موجود انسانی وجود پر لگے بے شمار چھپے کانٹے ابھر کر سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ کانٹے جو ہم اپنے آس پاس کے متاثرہ لوگوں پر زبان کی لذت کی خاطر خود بھی جانے انجانے میں لگاتے ہیں۔

یہ ناول ہمارے معاشرے کے اس اجتماعی رویے پر شدید تنقید ہے جس میں زخموں پر مرہم رکھنے سے زیادہ ان کو کرید کر مرچیں لگانے کا کردار ادا کیا جاتا ہے۔ اکرام اللہ کا ناول ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم سب میں ہمدردی اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کتنی کمی ہے اور دوسرے لوگ عذاب کیوں ثابت ہوتے ہیں، جیسا کہ شفیع کے ساتھ اس کی بھابھی، دوستوں اور اس کی محبوب ریحانہ نے اس کو بتا کر یا یہ سوال پوچھ کر تکلیف میں مبتلا کیا کہ کیا وہ اپنے باپ کی اولاد نہیں ہے؟ اعلیٰ طبقے کی منافقت، بے رو روی اور مفادات کے لیے کسی حد تک گر جانے کی جو تصویر کشی اس ناول میں کی گئی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ ناول میں لمبی چوڑی منظر نگاری نہیں کی گئی۔ تہہ در تہہ خود کو کھولتی اس کہانی میں واقعیت بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس واقعیت میں جلدی سے سب کچھ کہہ دینے کی خواہش نظر نہیں آتی بلکہ یہ دھیرے دھیرے اپنا اصل موضوع کو سامنے لاتی ہے۔

گرگِ شب

سالِ اشاعت: 1977

اکرام اللہ

میں نے اپنے چوبارے کی کھڑکی کھول کر باہر سڑک پر دیکھا۔ کچھ کالا کالا سا اجلا، کچھ اجلا اجلا سا اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا یہ احساس پیدا کر رہا تھا جیسے میرا چوبارہ کسی بہت بڑی اور بہت ہی گہری جھیل کے درمیان تہہ میں واقع ہو۔ خاموش کثیف پانی ہر طرف سے مجھ پر مردہ بوجھ کی طرح دباؤ ڈال رہا تھا اور ڈراتا چلا جا رہا تھا۔ میرے سامنے چھوٹی اینٹ کے ٹوٹے پھوٹے مکان دور تک حدِ نگاہ اسی طرح پھیلے تھے جیسے اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیر کھنڈرات کی صورت میں پانی میں ڈوبے بکھرے پڑے ہوں۔ کھڑکی میں زانوؤں تک اونچا ایک بوسیدہ، بدرنگ لکڑی کا جنگلہ تھا جس میں کبھی زیبائش کے لیے چوگوشہ سوراخ بنوائے گئے ہوں گے جو اب بگڑ کے بدشکل ہو چکے ہیں۔ میں یہ جنگلہ پھلانگ کر باہر چھجے پر کیوں نہ جا کھڑا ہوؤں؟ یہ سوچ کر میں کانپ اٹھا۔ خوف سے میرے پیٹ کی گہرائیوں میں تجلک زدہ دھاگوں کے بڑے بڑے گچھے پھیل پھیل کے سکڑنے لگے "کیا تمہیں یاد نہیں کہ دیکھنے والی ایک حرکت ایک اونچی آواز اس خاموش، ساکت، کثیف، بوجھل مائع اجالوں اندھیروں میں لہروں کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر سکتی ہے کہ وہ لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر تیز سے تیز ہوتی جائیں گی اور آخرکار زور پکڑتے پکڑتے اتنی طاقت ور ہو جائیں گی کہ جھیل کو ہلا کے رکھ دیں گی۔ یہ اینٹوں کے پھیلے ہوئے ڈھیر، یہ کھڑکی اور یہ سڑک ان کے بیچ پس کے رہ جائیں گے اور پھر جب طوفان ختم ہو گا تو جھیل کی سطح پر پرسکون ہوتی ہوئی لہروں کے درمیان سفید جھاگ بن کر تیرتے ہوئے پھر رہے ہوں گے۔ خطرے کے اس مکمل احساس کے باوجود میں نے پاؤں سے

چپل اتار کر نہایت احتیاط سے جنگلے کے اوپر سے ہولے ہولے ٹانگ گزار کر چھجے پر پہلے ایک پاؤں رکھا، پھر دوسرا رکھا۔ ذرا سا جھک کے نیچے دائیں طرف دیکھا۔ دور کسی موہوم سے سیاہ نقطے سے شروع ہوتی ہوئی سڑک سرپٹ دوڑتی ہوئی آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی اور شائیں سے چھجے کے نیچے سے گزرتی جا رہی تھی جیسے کبھی نہ ختم ہونے والی کوئی تیز رفتار ٹرین۔ یہاں یہ سڑک کہاں سے آ گئی۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تو چوبارہ غائب تھا، کھڑکی غائب تھی مع اپنے چھ گوشہ سوراخوں والے جنگلے کے۔ میں ہوا میں چھجے پر کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا۔ چھجا کبھی میرے پاؤں تلے سے نکل گیا، نہیں میرے پاؤں ہی چھجے پر سے اکھڑ گئے۔ پتہ نہیں کیا ہوا لیکن جو نہ ہونا چاہیئے تھا آخر وہی ہوا۔ پتنگ زدہ دھاگوں کے بڑے بڑے گچھے اور تیزی سے پھر پھیل کے سکڑنے لگے اور میں نیچے گرتا جا رہا تھا، اتھاہ گہرائیوں میں۔ سڑک کہاں چلی گئی؟ وہ اتنی دور تو نہ تھی۔ اب تک تو مجھے تربوز کی طرح دھپ سے ٹکرا کے پھٹ جانا چاہیئے تھا۔ اب یہ لہریں کیا کریں گی؟ میں چھجے پر کیوں چلا آیا تھا؟ سڑک تو جنگلے کے اندر رہتے ہوئے بھی ذرا سا جھک کر دیکھی جا سکتی تھی۔ آخر سڑک پر تھا بھی کیا۔ کچھ بھی نہیں۔ میرے پھیلے ہوئے بازو (مرے ہوئے سکندر کی طرح اپنے بس سے باہر) اور بے قابو ڈھیلی ڈھالی ٹانگیں چکر کھا رہی تھیں، میں ہولے ہولے گھومتا ہوا جا رہا تھا کبھی سر کے بل کبھی پہلوؤں کے بل۔ رضیہ کے گڈے کی طرح جو میں نے آنٹی ڈٹی میں کوٹھے پر ہوا میں اچھال دیا تھا۔ وہ چکر کھاتا ہوا فضا میں کچھ اونچا ابھرا، پھر ٹانگیں اور بازو لڑکھڑائے دیوار کے اوپر سے ہوتا ہوا نیچے نالی میں منہ کے بل جا گرا تھا۔ اس کی تنی ہوئی مونچھیں، اس کی چھلی چھلی سیاہ آنکھیں بارعب بھنویں، سرخ دھاگے سے گڑھے ہوئے ہونٹ سب کالی غلیظ کیچڑ میں لت پت ہو کے ایک ہو گئے تھے۔

"اللہ کرے شفیع تو مر جائے۔ اوں اوں شفیع تیرا کچھ نہ رہے، تیرا اپایا ہو"۔ رضیہ کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ دونوں ہاتھ جن میں لمحہ بھر پہلے گڈا تھا اب خالی اور بے بس آنکھوں پر

تھے۔ گنڈے کی محبت میں پاگل رضیہ کی سسکیوں میں لپٹی گالیاں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ میں اب برستی ہوئی نیلی نیلی دھند میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ ابھی نہیں آئی؟ میں گنڈا ہوں تو ظفر کہاں ہے۔ اللہ کرے شفیع تو مر جائے۔ تو پھر میں رضیہ ہوں تمہیں میں رضیہ اور گنڈا ہوں۔ شفیع پھر نکل گیا۔ ہنستا ہوا گلی گلی کرتا ہوا۔

"ظفر!" میں نے آواز دی۔

"ظفرررررررررررررررررر....." جھیل کے شکم میں کہیں دور چھپی ہوئی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی پھیلتے سکڑتے گچھوں کے جال میں میرا رواں رواں الجھا جا رہا تھا۔ گڑگڑاہٹ اور اونچی ہوئی تو اس نے سوئی ہوئی لہروں کو جگا دیا۔ پہاڑوں کی طرح بلند، طوفانوں کی طرح تند و تیز لہریں اب اپنے مسکنوں سے چل پڑی ہیں۔ وہ ابھی سب کچھ پیس ڈالیں گی۔ گڑڑڑڑ گڑڑڑڑڑڑ۔

مجھے اتنا چیخنے کی کیا ضرورت تھی۔ خاموشی سے گزر رہے تھے گزرتے چلے جاتے۔ لیکن وہ میرے چیخ سے پاؤں چھٹتے ہی جاگ پڑی ہوں گی۔ اتنے بڑے جھٹکے کی وہ کیونکر متحمل ہو سکتی تھی؟ اب تک وہ آہستہ آہستہ طاقت اکٹھی کر رہی ہوں گی۔ میرے آواز دینے سے کیا فرق پڑ سکتا تھا؟ وہ تو جو ہونا تھا پہلے ہی ہو چکا تھا۔ آواز کا کیا قصور ہے؟ چیخ کا قصور ہے چیخ کا قصور ہے؟ ظفر کا قصور ہے۔ ظفر کا کیا قصور ہے؟ گنڈے کا قصور ہے۔ گنڈے کا کیا قصور ہے؟ شفیع کا قصور ہے۔ شفیع کا کیا قصور ہے؟ رضیہ کا قصور ہے۔ رضیہ کا کیا قصور ہے؟ وہ یہ کہ اس نے گنڈا بنایا ہی کیوں۔ مگر رضیہ کا کیا قصور ہے؟ گڑگڑاہٹ اور تیز ہو گئی۔

ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ میں پسینے میں تر بتر ہانپ رہا تھا۔ کانپ رہا تھا۔ یہ خواب آخر کو میری جان لے لیں گے۔ کئی مہینے ہو گئے ہر رات باقاعدگی سے اسی طرح ڈراؤنے بھیانک،

بے سرو پا خواب دیکھتے ہوئے سرہانے پڑے ٹیبل لیمپ کو روشن کیا۔ اندھیرے کی آغوش سے ایک چمکدار کمتا کمرہ برآمد ہوا۔ ایش ٹرے سے سگریٹوں کے ٹکڑے ابلے پڑے تھے۔

کمرے سے واپس کرجو میں نے وہسکی کا گلاس بنایا تھا وہ آدھا بھرا میز پر نہایت انکساری کے انداز میں کھڑا تھا۔۔۔ یہ شیخ بلانوش ہے اور مجھے بھی خراب کرتا ہے تو پھر تو نے گھر آکے وہسکی کا گلاس کیوں بنایا؟ میرے سر اور گردن سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پلنگ سے پاؤں نیچے لٹکائے تو سامنے روئی کے گالوں کی طرح سفید چھوٹا سا کتا مسکراہٹ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے زور زور سے دم ہلا رہا تھا۔ میں نے سر ہتھیلیوں میں لے لیا۔ کتے نے دیکھا کہ مالک کوئی نوٹس نہیں لے رہا تو ایک ہلکی سی جست لگا کر میرے پاؤں سے لپٹ گیا۔ "نو جنکی نو۔۔۔ نو۔۔۔" جنکی اس تنبیہ کی پروا کئے بغیر اپنی چھوٹی سی گلابی زبان سے میرے پاؤں چاٹنے لگا۔ اس وقت کتے کے گرما گرم اظہار محبت سے مجھے سخت کوفت اور جھنجھلاہٹ ہوئی۔ میں نے جنکی کو پاؤں سے اٹھا کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے ڈانٹ پلائی "گٹ آؤٹ"

جنکی شرمندہ ہوتے ہوئے اپنی ٹانگوں میں دم دبا کر بھیگی بلی بنا پلنگ کے نیچے کھسک گیا۔ میں نے پاؤں سے چپل تلاش کی نظر کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں تو ایئر کنڈیشنر فٹ ہے وہ تو کھل ہی نہیں سکتی، چپل کہیں نہیں ہوگی وہ کھڑکی تو میرے گھر کی تھی میرے فیروز آباد والے گھر کی اس گھر کو چھوڑے تو اب تیس سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا۔ انہیں کچھ خبر نہیں کہ میں کس حال میں ہوں کہاں ہوں نہ میں نے کبھی ان کے متعلق جاننے کی کوشش کی ہے کہ جس حالت میں نکلا تھا اس روز وہ سب میرے لئے مر چکے تھے۔ اب کیا کرنا ہے یہ جان کر کہ کون زندہ ہے اور کون مر گیا۔ ماں جی اگر زندہ ہوتی تو شاید میں اس گھر سے اتنا مکمل قطع تعلق نہ کر سکتا تھا۔ میں نے الماری سے انالجیزر نکالی، گلاس لیا، غسل خانے کے نل سے پانی بھرا، سر درد کی دو گولیاں ہلق ہوئی انالجیزر سے کھا کے پلنگ پر لیٹ گیا۔

اب نیند آجائے تو اس عذاب سے نجات ہو۔ میں نے روشنی بند کر کے ٹیبل لیمپ
کی جانب ہاتھ بڑھایا مگر حوصلہ نہ پڑا۔ اندھیرے کے تصور سے ہی جی گھبرانے لگا۔ آنکھیں
بازوؤں کی اوٹ میں لے کر کروٹ لے لی۔ میں نے کل ایک شام میں ان لوگوں پر فضول
ایک ہزار روپیہ خرچ کر دیا۔ اونچی سوسائٹی میں متعارف ہونے کے لئے اس سے آسان اور
بہتر طریقہ نہیں اور کاروبار میں وسعت تعلقات کے پھیلاؤ پر منحصر ہوتی ہے۔ میری یہ
درمیانی سی فرم اب تقریباً آٹھ دس لاکھ روپے سالانہ منافع کماتی ہے مگر مجھے صرف اس پر تو
نہیں بیٹھ رہنا۔ مثلاً اب صنعت لگانا چاہتا ہوں جو تجارت کی نسبت کہیں زیادہ تیزی سے روپیہ
کماتی ہے اور جس میں آگے بڑھنے اور ترقی کے مواقع بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ بڑا صنعت کار بننے
کے لئے سرمائے کے علاوہ اور چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً سرکاری افسروں اور بڑے
بینکاروں سے بے تکلف دوستانہ مراسم، اونچے درجے کے صنعت کاروں سے جان پہچان
وغیرہ وغیرہ مجھے یقین ہے اگر اے۔ بی شیخ اور رستم علی کے خاص دوستوں کے زمرے میں
اپنا مقام پیدا کر لوں تو یہ مراحل جلد اور آسانی سے طے کر سکتا ہوں۔ ان لوگوں کی ان اونچے
حلقوں میں جہاں کام نکلتے ہیں، اچھی خاصی واقفیت ہے۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں گا اور
جب دیکھوں گا کہ یہ میرے زیادہ سود مند نہیں رہے تو ان سے کٹ کے الگ ہو جاؤں گا۔
دیکھو آج شام رستم علی مجھے مسز بل کی پارٹی پر مدعو کرتا ہے یا نہیں۔ اگر نہ بھی کرے تو کیا
ہے میں اس چھوٹی سی بات کے لئے ابھی ان لوگوں کو چھوڑنا برداشت تو نہیں کر سکتا۔ یہ شمیم
بڑی تیز عورت ہے۔ کل شام کیسے مسز بل سے چپکی جیسے مدتوں کی جان پہچان ہو۔ تین بچوں
کی ماں ہے لیکن ابھی بھی بدن میں بڑی سکت ہے۔ چہرے میں تو پوری پوری جاذبیت برقرار
ہے۔ بڑھتی عمر سے ادھر ادھر جو کہیں شکن پڑی ہے اسے اپنے نخرے ٹھسکے سے خوب متوازن
کر لینے کا گر جانتی ہے۔ میرے خیال میں تو بے چارے رستم علی اتنا کاروبار پھیلانے کی اہلیت

کہاں رکھتے تھے۔ یہ بیشتر شمیم کی عشوہ گری کا اعجاز نظر آتا ہے۔ اطمینان سے تکیے پر دھرے
ہوئے پر سکون چہرے پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اگر شمیم جیسی عورت
سے شادی کرلوں تو کیسی رہے گی؟ مجھے ان ہتھکنڈوں کی کیا ضرورت ہے۔ میں اگر کسی شمیم
کی مدد کے بغیر اس برآمد کرنے والی ایک فرم کے لاوارث دیہاتی کلرک کی حیثیت سے ابھر
کر ایک کپاس برآمد کرنے والی فرم کا مالک بن سکتا ہوں تو آئندہ اپنے زور بازو پر ایک کامیاب
صنعت کار بھی بن سکتا ہوں۔ کہاں وہ فیروز آباد جہاں چند ہزار کی سالانہ آمدنی ہوا کرتی تھی۔
میاں جی سال میں دو بار ایک پھٹیچر سی گھوڑی پر سوار ہو کر قریبی دیہات میں مزارعوں سے
بٹائی وصول کرنے جاتے اور دو تین دن بعد وہاں سے لوٹتے تو گھر میں ہر شخص ان کی طرف
دیکھ رہا ہوتا۔ میری سوتیلی ماں، میرے دو سوتیلے بھائی ان کی بیویاں، رضیہ، میری ماں، غریب
رشتے دار، نائی دھوبی کتنے لوگوں کا انحصار ہوتا تھا اس مختصر سی رقم پر۔ زمین ایک کنجوس تھیلی
کی طرح سال میں صرف دو مرتبہ گھٹا گھٹایا سامنے کھولتی تھی۔ اس قلیل آمدن میں سے زیادہ
سے زیادہ حصہ لینے کے لئے وہاں کیا کیا سازشیں چلی جاتی تھیں۔ میں اور رضیہ [illegible]
دروازوں کے پیچھے چھپے دراڑوں میں لڑائی جھگڑا اور تو تکاری ہوتی دیکھتے رہتے۔ میری ماں کہنے
کو تو آدھے حصے کی دعویدار ہوتی تھی اور بقیہ آدھے میں میری سوتیلی ماں کے پورے خاندان کو
گزر اوقات کرنے کے لئے کہتی لیکن در حقیقت چاہتی یہ تھی کہ میاں جی کو بہلا پھسلا کر یا
دھونس دھڑلے سے ان سے زیادہ سے زیادہ رقم ہتھیا لے۔ دوسرے فریق کا موقف یہ ہوتا
تھا کہ تمام آمدنی کے تین برابر حصے کئے جائیں، تین بیٹوں کے لحاظ سے ایک حصہ میری ماں کو
ملے اور دو حصے میری سوتیلی ماں کو اور میاں باری سے ایک دن ہمارے ہاں اور ایک دن سوتیلی
ماں کے ہاں کھانا کھائیں اور کچھ رقم اپنے اخراجات کے لئے بے شک الگ لے لیا کریں لیکن
تمام حساب ہوتا سب کے سامنے چاہئے نہ کہ میاں جی چوبارے میں بیٹھ کر حصے تقسیم کرکے

لے آئیں جو کہ میری میاں جی اور میری ماں کی رہائش گاہ تھا، کیونکہ ان کا خیال تھا (اور درست خیال تھا) کہ اس طرح میری ماں بہت سی رقم پہلے سے ہی خرد برد کر جائے گی جو میاں جی نہ تو بتانے اور نہ اس سے اگلوانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ دونوں فریق اپنے اپنے تقسیم کے اصولوں پہ مضبوطی سے ڈٹے رہتے اور اپنے مطالبوں سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو آمادہ نہ ہوتے تھے۔ میاں جی حد درجہ حلیم، متین اور کم گو طبیعت کے مالک تھے۔ وہ کسی سے بے انصافی نہیں کرنا چاہتے تھے مگر اپنا حق زور سے منوانے کے اہل بھی نہیں تھے، اس لئے میری ماں ہمیشہ زیادہ حصہ لے جاتی اور جتنی بھی سب سے زیادہ۔ میرا بھائی خاص طور پر میری بھابیاں میری ماں کی دھاندلیوں پر پرزور احتجاج کرتیں، بھائی آخر پاؤں پٹختے بلند آواز میں بولتے باہر چلے جاتے بھابیاں دوپٹے آنکھوں پر رکھے ذکتی رہتیں، ماں فاتحانہ انداز میں چوبارے اور چوبارے کے سامنے پھیلے ہوئے صحن کے درمیان گھر کے کام کاج میں مشغول آتی جاتی میاں جی کو کہہ رہی ہوتی۔ "میں اگر کچھ نہ بولوں تو تم سب کچھ اٹھا کر انہیں کو دے دو اور ہمیں بھوکا مارو، دو دیکھ لو یہ لوگ تمہاری زندگی میں میرا اتنا برا حال کرتے ہیں تو تمہاری موت کے بعد تو خدا جانے میرا کیا حشر کریں گے۔ ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ میرا اچھوٹا سا بچہ ہے۔ کچھ زمین میرے نام لکھوا دو مگر تم کچھ سنتے ہی نہیں"۔ پھر زار و زار رونے لگتی میاں جی عینک لگائے چارپائی پر دبکے خاموشی سے کتاب کے ورق الٹتے رہتے۔ دل میں خدا معلوم کیا سوچتے ہوں گے ان کے چہرے سے کچھ عیاں نہ ہوتا۔ جب یہ ڈرامہ ان کی برداشت سے بالکل باہر ہو جاتا تو ہاتھ میں کھونڈی پکڑے سر ہلاتے احتیاط سے قدم قدم سیڑھیاں اتر جاتے۔

میں نے اپنی سوتیلی ماں کو کبھی کسی جھگڑے میں بھی حصہ لیتے نہیں دیکھا وہ پیڑھی پر خاموشی بیٹھی رہتی اور اگر میاں جی وہاں ہوتے تو اپنے سفید بغیر کلف کے دوپٹے کو سر پہ سے نیچے کھسکا کر ماتھا بھی پوری طرح ڈھانپ لیتی اور ان کی موجودگی میں کبھی غلطی سے بھی نظر

اونچی نہ کرتی۔ اس نے مجھ میں اور رضیہ میں کبھی کوئی فرق نہیں سمجھا۔ میری ماں سامنے نہ ہوتی تو مجھے خوب لپٹا لپٹا کر پیار کرتی محبت سے کھانا کھلاتی۔ رضیہ سے جھگڑا ہو جاتا تو شفقت سے سمجھاتی کہ دیکھ یہ تیری بھتیجی ہے چھوٹی سی پیاری سی بھتیجی اسے مارا نہ کر۔ میں بھی اس سے اس طرح ضد کر کے پیسے مانگتا تھا جیسے میری اپنی ماں ہو، کوئی شفیق بزرگ ہو۔ بڑی بھابھی نے کبھی مجھے آنکھ میں جگہ نہ دی تھی اور نہ میری کبھی یہ جرات ہو سکی تھی کہ اس کے نزدیک پھٹک جاؤں اگرچہ چھوٹی بھابی سے خوف نہیں آتا تھا لیکن اس کے بھی روکھے رویے کو دیکھ کر مجھے کبھی میل جول بڑھانے کی جرات پیدا نہ ہو سکی تھی۔ میں اپنے ہوش سنبھالنے کے دن سے لے کر فیروز آبادی زندگی کے آخری دن تک مختلف لوگوں سے مختلف رنگ ڈھنگ میں ایک بات سنتا رہا تھا کہ میری شکل اپنی سوتیلی ماں سے ہو بہو ملتی ہے۔ لوگ بڑی کٹیلی ہنسی ہنستے ہوئے بہت معنی خیز استعجاب کا اظہار کرتے کہ بچوں کی شکل اپنے والدین سے ملتی ہے یا بہن بھائیوں سے ملتی ہے، کسی کو اپنی سوتیلی ماں پر پڑتے نہیں دیکھا۔ واقعی میری صورت اپنی سوتیلی ماں سے بہت ملتی تھی، اور اپنی اصلی ماں، باپ اور بہن بھائیوں سے قطعی مختلف تھی۔ وہی چوڑی چکلی، بھدی ناک وہی پھیلا ہوا دہانہ، وہی گھنگریالے بال، وہی چہرے کا کٹاؤ وہی سانولا رنگ، وہی ماتھے کے وسط میں مسا، وہی سیاہ روشن آنکھیں اور اب وہی لمبا قد اور وہی دوہرا جسم۔ وہ جب رضیہ کو گندی نالی میں گرا تھا اور رضیہ کی ماں نے نیچے صحن میں کھڑے ہو کر ہاتھ لمبا کر کے مجھے کوسنے دیئے تھے اور میری ماں نے جواباً پہلے چھت کی حفاظتی دیوار سے نیچے دیکھتے ہوئے گالیوں کا طومار باندھ دیا تھا اور پھر جب بات اور بڑھ گئی تو وہ بھی نیچے اتر آئی تھی۔ سب ایک دوسرے کے خلاف بغض و عناد سے بھری تو ہر وقت رہتی تھیں یہ ذرا موقع ملا تو پھٹ پڑیں۔ خوب جی کھول کر ایک دوسرے کے میکے والوں کو گالیاں دی جا رہی تھیں۔

میری سوتیلی ماں بڑی بھابی کا بازو پکڑ کے کھینچ رہی تھی "اے بہو! خدا کے لئے تو ہی جانے دے۔ دنیا ہنسے گی تو کیا کہے گی۔ چل میری بچی اندر۔"

رضیہ جو فریادی تھی وہ اپنا دعویٰ اور رونا دھونا بھول کر اپنی خوف زدہ آنکھیں اور اترا ہوا چہرہ لئے ستون سے کمر لگائے خاموش کھڑی حیرانی سے سب ہوتا دیکھ رہی تھی جو اس کی سوچ اور سمجھ سے بہت باہر تھا۔ میں ڈیوڑھی کے ایک اندھیرے کونے میں منہ دیئے ہوئے کھڑا اپنے پورے بدن سے زور لگا رہا تھا کہ یہ دیوار پھٹ جائے تو میں اس کے اندر سما جاؤں، یہ میں نے کیا کر دیا۔

سوتیلی ماں نے چیختے ہوئے بھابی سے کہا! "بہو! کیوں میرے سفید چونڈے میں راکھ ڈالنے پر تلی ہے۔ تو ہی عقل سے کام لے۔ اندر چل جا!"

بھابی نے زہر میں بجھی ہوئی بغل چھری چلائی "مجھے منع کرتی ہیں اسے کچھ نہیں کہتیں جو بھونکے جا رہی ہے ہاں ہاں تُو تو اس مر جانے شفیع کی حمایت کرے گی ہی، تیرا تو وہ کچھ لگتا ہے نا۔"

تیر نشانے پر بیٹھا۔ میری ماں تلملا اٹھی لیکن بات بدل کر وار کیا۔ "میرے بھائی کو کہتی ہے کہ جیل میں ہے۔ وہ لڑ کر جیل گیا، مرد ہے مرد اپنی بہن کو سنبھالے جو گاؤں کے میراثی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

اتنی بے عزتی کا جواب نہ دینا بھابی کے بس کے باہر تھا۔ ایک بات جو وہ اتنی دیر میں اشاروں میں ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ سب بند توڑ کر بلا جھجک اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ "اے بی بی! ذرا اپنی چارپائی کے نیچے ڈانگ پھیر۔ میری بہن تو میراثی کے ساتھ بھاگ گئی تھی نا تُو نے تو میرا خاوند مجھ سے چھینا ہوا ہے سوتیلے بیٹے سے یارانہ لگایا ہوا ہے شرم ہے تو کہیں ڈوب مر۔ اسی کے بیج سے پیدا کر کے اس کے سامنے شریک کھڑا کر دیا ہے۔" بھابی نے ابھی فقرہ

مکمل نہ کیا تھا کہ بڑا بھائی میرے پاس سے گزر کر اندر صحن میں کھڑا رہا۔ میری ماں دونوں ہاتھوں سے چھاتی اور رانوں پر پیٹ رہی تھی اور زار و قطار روئے جا رہی تھی "ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں مجھ پر ایسی تہمت؟ غلام احمد اس گشتی زن کو سمجھا لے نہیں تو خون ہو جائیں گے۔"

بھائی نے کسی کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور آؤ دیکھا نہ تاؤ ڈنڈا اٹھایا اور بھابی کو دھواں دھو پیٹنا شروع کر دیا۔ میاں جی باہر سے آئے اور ڈیوڑھی کے کونے میں مجھے دبکا دیکھا تو بازو سے پکڑ کر مجھے اپنی ٹانگ سے لپٹاتے ہوئے اندر صحن میں لے آئے میں سہما ہوا ان کی ٹانگ سے چمٹا کھڑا تھا۔ میری ماں دیکھتے ہی ان پر غضبیل بھڑ کی طرح حملہ آور ہوئی۔ ان کے کرتے گریبان کو دونوں مٹھیوں میں زور سے بھینچ لیا "دیکھ لو! یہ کتیاں کتنیاں مجھ پر کیا تہمتیں لگاتی ہیں، ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے الگ مکان ہو دو میں آج تمہیں مار ڈالوں گی یا انہیں مار دوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دھکا جو دیا میاں جی دیوار سے جا ٹکرائے ان کی ڈھیلی ڈھالی سفید پگڑی ان کے سر سے پھسل کر آدھی کان پر آ رہی، میں نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے چہرے پر اب بھی وہی صبر و شکر چھپا تھا۔ آدھی پگڑی میں پھنسا سر بے بسی سے ہل رہا تھا شام کے پھیلتے دھندلکوں میں پڑوسی منڈیروں پر سے بیچ تماشا دیکھ رہے تھے تماشا دیکھنے والی پوری بے حسی اور لاتعلقی سے میری سوتیلی ماں نے دوڑ کے جا کے میاں جی کی ڈھلکی ہوئی پگڑی ان کے کندھے سے اٹھا کر ان کے سر پر رکھی، انہوں نے اتنا کہا "غلام احمد! اندر لڑکی کو تنہا" اور سیڑھیاں چڑھ گئے۔

آج ان لوگوں کو میری آمدن کا علم ہو تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔

دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ "صاحب جی! چائے"۔

"لے آؤ بیٹو"!

میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے سات بج رہے تھے۔ پھرتی سے بستر سے اٹھا اور سڑ سڑ چائے پینے لگا۔

اکرام بریلوی-(1918-2018)

انکا اصل نام سید سعادت حسین کاظمی تھا لیکن انہوں نے قلمی نام اکرام بریلوی اختیار کیا تھا۔ وہ تقسیم کے بعد ہجرت کر کے کراچی آ گئے تھے۔ کئی برس یہاں رہنے کے بعد وہ کینیڈا منتقل ہو گئے اور وہاں کی شہریت لے لی۔ ان کا خاص میدان فکشن تھا۔ انہوں نے افسانے بہت کم لیکن ناول ایک تواتر سے لکھے۔ ان کا صرف دو افسانوی مجموعے "تیز ہوا میں بیج" اور "تیسری نسل" شائع ہوئے۔ ان کا پہلا ناول "نیا افق" 1946 میں شائع ہوا۔ جس کے بعد ان کے تقریباً دس ناول چھپ کر منظر عام پر آئے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ گردش (1956)، زلف کے سر ہونے تک (1958)، آشوب سر(1962)، لاوا(1978)، پل صراط(1988)، مجمع تفریق تقسیم(1999)، کانٹے کی زبان(ناولٹ)۔ ناول کے علاوہ انہیں ڈرامانگاری اور تنقید و تحقیق سے بھی دل چسپی تھی۔ ان کے ڈرامے "برف کی دیوار"، "شرار سنگ" چھپ کر سامنے آئے۔ انہوں نے عشرت آفریں، مومن خاں مومن، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی اور سلطان جمیل نسیم پر تنقیدی کتابیں بھی لکھیں۔ اس انتخاب میں ان کے ناول "لاوا" سے چند صفحات شامل کیے ہیں۔

"لاوا" اکرام بریلوی کا تیسرا ناول ہے۔ یہ "فراز" نامی ایک کردار کے گرد گھومتا ہے جسے ناول میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ سب کچھ اسی کے نکتہ نظر سے دکھایا اور بیان کیا گیا ہے۔ اس کردار کے گرد کہانی کا پہلا دائرہ کھنچا ہوا ہے۔ فراز کی پیدائش، اس کے گھر کا مخصوص ماحول، تعلیم، جسم اور جنس کے ابتدائی تجربات — اس کے بعد کہانی کا دوسرا دائرہ شروع ہوتا ہے۔ مرکزی کردار فراز کا عملی زندگی سے تصادم، سیاسیات اور اس کے اندر اٹھنے والے ذہنی طوفان۔ اور اس کے بعد تیسرا دائرہ۔ جو اگر پہلے کی بازگشت معلوم ہوتا ہے لیکن وہ

دوسرے دور تک بھی ہے۔ یہیں اس کی زندگی میں لاوے کی طوفانی آگ خاص پیمانوں میں ڈھلتی ہے۔ زمانہ بھی اسی صورت آفرینی کا منتظر ہے۔ عالم گیر جنگ سے نظریوں کے بڑے تصادم، خاک و خون میں مل کر بہت سے نئے تصادم انسان کے سامنے لا کھڑے کیے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی زندگی گزارنے کی راہیں متعین ہو چکی ہیں۔ یہاں دو قومیں بن چکی ہیں۔ فرز کی خارجی زندگی کا لاوا اب ایک خاص پیمانے میں ڈھل چکا ہے۔

اس مرحلے پر ایک اور دائرہ سامنے آتا ہے۔ یہ ہے زندگی کی تعمیر و ترقی، اس کی تہذیب و جمال کا سب سے مثبت تیز دور۔ فرز کی شادی یعنی ایک اور زاویے سے تصادم۔ پھر غم کی آگ، جس میں تپ کر رات لاوا نئیں کندن بنتا ہے، اسی مقام سے ابھر کتی ہے۔ یہ اس کی بیوی کی موت کا غم ہے۔ یہاں غم کی روایت سے تطابق بھی ہے اور روایت شکنی بھی۔

لاوا

سالِ اشاعت:1978

اکرام بریلوی

کتنی بھیانک تھی وہ رات!

گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گہرے سرمئی بادل جھکے چلے آ رہے تھے، بارش اس طرح ہو رہی تھی کہ جیسے جل تھل ایک ہو جائے گا۔ تاریکیاں اس طرح پھیلی تھیں کہ جیسے کبھی نہ سمٹ سکیں گی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ بڑے بڑے درخت اکھڑ کر منہ کے بل زمین پر آ پڑے تھے۔ وحشی طیور، اور آوارہ جانور بھٹکتے پھر رہے تھے۔ گیدڑ اور جنگلی کتے اس طرح بھونک رہے تھے کہ جیسے صورِ اسرافیل پھونکا جا چکا ہے۔ اور وہ یونہی بھونکتے بھونکتے دم توڑ دیں گے۔ بجلی ٹھہر ٹھہر کر چمک رہی تھی۔ جیسے مطلب پور کے گاؤں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گی۔

گاؤں کی پوری آبادی پر سکتہ طاری تھا۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی، جیسے سارے گاؤں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہوا کے غیر معمولی شور، بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک نے ہر ابھرنے والی آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ صرف مطلب پور کے تھانیدار کے گھر میں سہمی ہوئی زندگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ ساری آبادی میں صرف یہی ایسا گھر تھا جہاں سے روشنی کی لرزتی ہوئی کرنیں ابھر ابھر کر بتا رہی تھیں کہ کوئی غیر معمولی بات وقوع پذیر ہونے والی ہے، ورنہ کون مینگنا تھا کہ اس قصر کے سامنے ٹھہر سکتا تھا۔

"رضیہ کو درد شروع ہو گئے ہیں" دایا ملک کی بہن اکبری بیگم نے کمرے کے اندر آ کر کہا۔

"پھر کیا کیا جائے؟ ایاز ملک نے سراسیمہ ہو کر دریافت کیا۔

"دائی کا انتظام ہونا چاہئے۔ ڈاکٹرنی تو اس وقت کہاں ملے گی" اکبری بیگم نے منہ بنا کر کہا۔

"اس گاؤں میں دائی بھی تو نہیں مل سکتی۔" ایاز ملک نے کہا۔

"پھر؟"

"وہ بھی تو آگست پور سے بلانی پڑے گی۔"

"پھر؟" اکبری بیگم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"صبح تک انتظار نہیں کیا جا سکتا؟" ایاز ملک نے کہا۔

"کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے ہو، ایاز۔ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ میرے منہ میں خاک اگر رضیہ کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا، تو اس کے گھر والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ کچھ نہ کچھ، انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ صبح کس نے دیکھی ہے؟" اکبری بیگم نے جلدی جلدی کہا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ کچھ وقت، کچھ دیر تو لگے گی۔ صبح تک کوئی انتظام ہو ہی جائے گا، حوالدار ناصر کو حسن آباد بھیجا ہے۔ اس طوفان کی وجہ سے نہیں آ سکا۔ صبح تک لیڈی ڈاکٹر کو لے کر پہنچ ہی جائے گا۔" ایاز ملک نے پر امید لہجہ میں کہا۔

"اور اگر بچہ رات ہی میں ہو گیا تو دونوں کے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ خدا کے لئے کوئی سبیل نکالو۔ ورنہ میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔" اکبری بیگم نے پھر کہا۔

"اتنا کیوں پریشان ہوتی ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ خود کوئی مناسب تدبیر کر دے گا۔ وہ قاضی الحاجات ہے ہماری حاجت بھی ضرور پوری کرے گا۔" ایاز ملک نے کہا۔

"آمین۔ مگر یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے تو آج تک کوئی کام نہیں بنتا ہے

۔"

"پھر؟"

"اس پہ تکیہ ضرور کرو۔ مگر کسی آدمی کو اگت پور بھیج کر دائی کا ضرور انتظام کر لو

ہاں خوب یاد آیا۔"

"کیا؟"

"وہ موا سائیں کس دن کام آئے گا؟ پڑے پڑے روٹیاں توڑتا ہے اسی کو گھوڑے پہ

دوڑا دو۔ آن کی آن میں دائی کو لے کر واپس لوٹ آئے گا۔" اکبری بیگم نے اپنی آواز میں بلا کا

تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہتی ہو مگر۔"

"مگر کیا؟" اکبری بیگم نے گھبرا کر پوچھا۔

"موسم بڑا خراب ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ کوئی سبیل تو کرنا ہی پڑے گی۔ اللہ کا نام لے کر بخشی کو روانہ

کر دو۔"

ایاز ملک نے کچھ سوچ کر کمرے کی کھڑکی کھولی۔ روشنی کی لہر تاریکی کا سینہ چیرتی

ہوئی باہر نکلی اور تیز ہوا کے جھونکے کے ساتھ پانی کی پھوار کمرے میں آتے ہوئے اس کا چہرہ

بھگو گئی۔ ایاز ملک نے خفیف سی جھرجھری لے کر زور سے پکارا۔

"بخشی!"

آواز گہرے سکوت میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی بازگشت میں تحلیل ہو گئی۔

"جی صاحب؟" بخشی کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔

"ابے وہاں اصطبل میں پڑے پڑے کیا کر رہا ہے بھاگ کر ادھر آ۔" ایاز ملک نے کڑک کر پولیس والوں کے مخصوص لہجے میں کہا۔

"ابھی آیا سرکار۔" جُمّی کی آواز آئی۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ چھوٹی سی لالٹین لئے کھڑکی کے پاس، ایاز ملک کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اصطبل سے کھڑکی تک آتے ہوئے، وہ پانی میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس کے پاؤں، زمین پر بہتے ہوئے گندے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہ لالٹین کی پیلی اور مدھم روشنی میں کھڑا سردی سے کانپ رہا تھا۔

"بیگم صاحب کی طبیعت خراب ہے۔" ایاز ملک نے جُمّی سے کہا۔

"جی!"، جُمّی نے پوچھا۔

"بیگم صاحب کو درد شروع ہو گئے ہیں۔"

"پھر؟"، جُمّی نے پوچھا۔

ایاز ملک نے کہا۔ "ابھی انگت پور جاؤ۔ اور دائی کو ساتھ لے کر الٹے پاؤں لوٹ آؤ۔"

"قدرت تمہارا امتحان لے رہی ہے" ایاز ملک نے کہا۔

"کون سی دائی؟"، جُمّی نے پوچھا۔

"سارے قصبے میں ایک ہی دائی ہے وہی شیریں۔"

"وہی نا جس کے شوہر کو سرکار نے پچھلے سال ناجائز شراب کی کشید کے جرم میں سزا پانے سے بچایا تھا؟"

"شاباش صحیح پہچانا۔ گھر تو معلوم ہے نا؟" ایاز ملک نے پوچھا۔

"جی سرکار، اچھی طرح جانتا ہوں۔" جُمّی نے وثوق کے ساتھ کہا۔

"اچھا تو جلدی کر، وقت تھوڑا ہے۔" ایاز ملک نے کہا اور کھڑکی بند کر لی۔

"چلا گیا؟" اکبری بیگم نے اپنے چھوٹے بھائی ایاز ملک سے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

"جی ہاں"

"کتنی دیر میں واپس آئے گا؟"

"پانچ اور پانچ دس میل کی مسافت ہے اگر موسم نے پریشان نہ کیا تو دو ڈھائی گھنٹے میں آنا چاہئے۔" ایاز ملک نے نرمی سے جواب دیا۔

جسی نے آناً فاناً میں گھوڑا اصطبل سے باہر نکالا۔ تیزی سے اچھل کر زین پر بیٹھا اور ایڑ دے کر سرپٹ حویلی کی حدود سے باہر نکل گیا ایاز ملک نے دوبارہ کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو جسی اور اس کا شہسوار گھوڑا ٹاپوں کی آواز اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا تاریکیوں کے گہرے غلاف میں غائب ہو گیا تھا۔

پورے دو گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟"

"میں ہوں جسی"

"لے آئے؟"

"جی سرکار"

ایاز ملک نے جلدی سے دروازہ کھولا اور شیریں کھدر کی موٹی سی چادر میں لپٹی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی۔

"بہت بے وقت تکلیف دی تمہیں شیریں۔" ایاز ملک نے لجاجت سے کہا۔

شیریں کی بھیگی ہوئی چادر اور کپڑوں کو دیکھ کر وہ بے اختیار موم دل ہو گیا تھا۔ اس کے لہجے میں اس وقت پولیس والوں کی ترشی اور تیکھا پن نام کو نہ تھا۔

"بندی آپ کی زر خرید لونڈی ہے۔ فرمایئے کیا کام ہے؟" شیریں نے جیسے پچھلے احسانات کا بدلہ چکاتے ہوئے کہا۔

"بیگم صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ درد شروع ہو گئے ہیں، تمہارے بغیر بے اطمینانی رہتی۔ اس لئے بلا بھیجا۔" ایاز ملک نے نرمی سے کہا۔

"بندی حاضر ہے۔ فرمایئے، بیگم صاحب کہاں ہیں؟" شیریں نے پوچھا۔

"برابر والے کمرے میں" ایاز ملک نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ آؤ"۔ اکبری بیگم نے آہستہ سے کہا اور شیریں کو اپنے ساتھ لے کر برابر والے کمرے میں چلی گئی۔ ایاز ملک کرسی میں دھنس کر بیٹھ گیا اور سگریٹ پیتے ہوئے آنے والی ساعت کا انتظار کرنے لگا۔

شیریں، اکبری بیگم کے ساتھ رضیہ کے کمرے میں آئی، قریب جا کر غور سے چہرے کو دیکھا، نبض ٹٹولی اور پھر رضیہ کو اپنی ناگوں میں لے کر، مسہری پر جم کر بیٹھ گئی۔

"بہن جی، سب کچھ خدا کے فضل سے ٹھیک ہے۔ اطمینان رکھئے۔" شیریں نے اکبری بیگم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"خوش رہو بہن کہو کیا حال ہے؟" اکبری بیگم نے پوچھا۔

"تکلیف کچھ کم ہے۔ آثار تو بچے ہی کے ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔" شیریں نے صوفیانہ انداز میں کہا۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ اچھا، اب تم انھیں لے کر بیٹھو میں کونے میں بیٹھ کر سورہ یسین کا ورد کرتی ہوں۔" اکبری بیگم نے کہا۔

"اس کار خیر سے آپ کو کون روک سکتا ہے۔" شیریں نے کہا۔

"کوئی ضرورت ہو تو خادمہ برابر والے کمرے میں موجود ہے۔" اکبری بیگم نے کہا اور سر اور چہرے پر دوپٹے کے پیچ لپیٹ کر سورہ یسین کی تلاوت میں مشغول ہو گئی۔ شیریں، رضیہ کو اپنی باہوں میں لے کر ذرا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ رضیہ نیم بے ہوشی کے عالم میں آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔

شیریں تمام رات رضیہ کو اپنی باہوں میں لئے بیٹھی رہی اور ایاز کی بہن سورہ یسین کا ورد کرتی رہی۔ بادلوں کی گرج کم ہو گئی تھی۔ ہوا بھی کسی قدر تھم گئی تھی مگر بارش اس طرح ہو رہی تھی جیسے آسمان میں بڑے بڑے سوراخ ہو گئے ہوں اور برسوں کا رکا ہوا پانی پورے زور کے ساتھ بہہ نکلا ہو۔

چار اور پانچ کے درمیان رضیہ نے اوپر تلے زور کی دو چار چیخیں ماریں۔ شیریں نے آزمائے ہوئے، دائیوں کے گر آزمائے اور بچے نے زور زور سے اس طرح رونا شروع کہ پھیپھڑے صاف ہو گئے۔ بچے کے رونے کی آواز سن کر اکبری بیگم ہڑبڑا کر مصلے سے اٹھیں اور پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"بیٹا مبارک ہو۔" شیریں نے شوخی سے کہا۔

"اور رضیہ؟"

"ٹھیک ہے ذرا جلدی سے خادمہ کو بلایئے۔"

اکبری بیگم تیزی سے برابر والے کمرے میں گئیں اور خادمہ کو اپنے ساتھ لے کر واپس آ گئیں۔

چھ بجے تک شیریں تمام کاموں سے فارغ ہو کر نومولود بچے کو زری کی چادر میں
لئے رضیہ کو دکھا رہی تھی۔ تاکہ اس کی کوکھ میں ٹھنڈک پڑے اور وہ رات بھر کی تکلیف بھول
جائے۔ رضیہ نے پیارے ننھے منے بچے کو دیکھا اور مسکرا کر، ایک طرف گردن پھیر لی۔

اکبری بیگم بھاگی ہوئی بھائی کے پاس گئیں اور کہا۔

"مبارک ہو۔ بیٹا ہوا ہے۔"

"رضیہ تو ٹھیک ہے نا؟" ایاز ملک نے کہا اور اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔

"سب ٹھیک ہے کہو کیا نام رکھا ہے؟" اکبری بیگم نے پوچھا

"نام، نام تو آپ ہی رکھیں گی۔"

"نہیں، اس کا نام تو تم ہی رکھو گے۔"

"زبردستی ہے۔"

"ہاں۔"

تو پھر کیا رکھا جائے۔

"اے لو اور وہ، الٹ کر مجھی سے پوچھنے لگے رکھو نا کوئی اچھا سا نام۔" اکبری بیگم
نے کہا۔

"کیسا ہے؟"

"خوبصورت، چاند سا چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ، لمبی ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ چھلے دار
بال اور کیا چاہئے جو رکھو نام بھی کوئی اچھا سا۔"

"تو پھر ہم اس کا نام فراز رکھتے ہیں کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔"

صبح سات بجے کے قریب مطلع صاف تھا۔ دھوپ اس طرح نکلی تھی جیسے سات
بچھو ہوا ہی نہ تھا۔ حوالدار ناصر لیڈی ڈاکٹر کو لے کر پہنچ چکا تھا۔ ایاز ملک کے گھر میں جیسے چاند
اتر آیا تھا۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور فراز کے کان میں گاؤں کی مسجد کا امام اذان
دے رہا تھا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اشھد ان لا الہ الا اللہ۔

الطاف فاطمہ-(1927-2018)

الطاف فاطمہ لکھنو میں پیدا ہوئیں۔وہ مولانا فضل حق خیر آبادیؒ کے وسیع خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے ماموں، سید رفیق حسین رضوی بہت اچھی کہانیاں لکھتے تھے۔حمیدہ اختر حسین رائے پوری ان کی خالہ زاد بہن تھیں۔ان کا بچپن علی عباس حسینی اور سید مسعود حسن ادیب رضوی کی سرپرستی میں گزرا۔ مسعود حسن رضوی کا جو بیٹا انہیں شوبادی کہہ کر بلاتا تھا،وہ ایک روز خود بھی اردو فکشن کا معتبر حوالہ بن گیا اور دنیا اسے نیر مسعود کے نام سے جانتی ہے۔ تقسیم کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ لاہور آ گئیں۔یہاں لیڈی میکلیگن کالج سے بی ایڈ کیا۔اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا اور پھر اسلامیہ کالج برائے خواتین،لاہور میں اردو کی استاد مقرر ہو گئیں اور اسی کالج سے شعبہ اردو کی سربراہ کی حیثیت سے ریٹائر ہو گئیں۔وہ لاہور میں میانی صاحب،قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ 1962 میں ادب لطیف میں شائع ہوا۔بی اے کے دوران جب ان کی آنکھ خراب ہوئی تو اس عالم میں ان کی والدہ انہیں پڑھنے سے روکتی تھیں تو انہوں نے رد عمل کے طور قلم چلانا شروع کر دیا۔یوں ان کا پہلا ناول ناول "نشان محفل" منصہ شہود پہ آیا۔مجموعی طور پر ان کے چار ناولوں کے علاوہ افسانوں کے چار مجموعے بھی شائع ہوئے۔وہ بہت عمدہ مترجم بھی تھیں اور ان کے تراجم کی چار کتابیں بھی شائع ہوئیں۔انہوں نے ہارپر لی کے شہرہ آفاق ناول How to kill a micking bird کا ترجمہ "نغمے کا قتل" کے ناول شائع ہوا۔الطاف فاطمہ کا "دستک نہ دو" بے حد مشہور ہوا۔اس ناول کو ڈرامائی

تشکیل دی گئی اور پاکستان ٹیلی وژن سے نشر کیا گیا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر الطاف فاطمہ کے متعدد ڈرامے بھی نشر ہوئے۔ رخسانہ احمد نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔

"دستک نہ دو" تقسیم ہند سے پہلے کے چند برسوں کے بارے میں ایک اچھا ناول ہے۔ اس میں متحدہ ہندوستان کے شاندار ماضی کا ذکر ہے، جس میں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے تھے، مگر اس ناول میں قیام پاکستان کے وقت ہونے والے فسادات میں صرف مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنتے دکھایا گیا۔ اس طرح فسادات کے اس وسیع پس منظر کو نظر انداز کیا گیا، جس میں ہندو، مسلم اور سکھ سب متاثر ہوئے تھے۔ گو کہ الطاف فاطمہ کی تحریروں کا یہ ایک نسبتاً کم زور پہلو ہے، پھر بھی ان کی خواتین کے کردار بڑے بھرپور ہیں۔

اس کی ایک مثال "دستک نہ دو" کی چھوٹی بچی "گیتی" ہے، جس کی ایک چینی مسلمان سے دوستی ہو جاتی ہے، جو سائیکل پر گھریلو سامان بیچتا پھرتا تھا۔ جب گیتی ایک درخت سے گر کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھتی ہے، تو یہی چینی اسے گھر پہنچاتا ہے اور پھر اس کی دل جوئی کے لیے روز چکر لگاتا ہے۔ اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود، گیتی اس چینی سے ملتی رہتی ہے، جس کا خاندانی نام "لیو چو" اور اسلامی نام، صفدر یاسین ہے۔ اس کردار میں ہمیں ٹیگور کے "کابلی والا" کی جھلک نظر آتی ہے، جو افغانستان سے بنگال جاتا ہے، جہاں اس کی ایک چھوٹی بچی سے دوستی ہو جاتی ہے۔ کابلی والا اور صفدر یاسین میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں اپنے گھروں کو یاد کرتے ہیں اور انہیں گھر سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی وطن میں، ایک چھوٹی بچی سے اپنائیت ہو جاتی ہے۔ گیتی اپنی سائیکل پر گھومتی پھرتی ہے اور بڑی ہو کر اپنے ایک رشتے دار سے اظہار محبت کرتی ہے، جس میں جھجک نام کو نہیں۔ جب گیتی کے گھر والوں کو اس یک طرفہ محبت کا پتا چلا، تو گیتی اپنی والہانہ محبت کا برملا دفاع کرتی ہے اور پھر کچھ عرصے بعد گھر چھوڑ دیتی ہے۔

دستک نہ دو

سالِ اشاعت: 1964

الطاف فاطمہ

اس شہر کا کیا نام تھا اور اس کی کیا اہمیت تھی۔ جس کی بعض کشادہ سڑکیں وہ ناپتا پھرتا تھا؟ اس کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کا کوئی بھی نام ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ اور اس نوعیت کا کوئی بھی شہر اس کا اپنا شہر نہیں ہو سکتا۔ اس کی ہر چیز اُس کے لئے نامانوس اور اجنبی تھی۔ وہ اتنی بہت سی اجنبی چیزوں میں گھرا ہوا تھا کہ ان کا شمار بھی نہ کر سکتا تھا۔

لیکن اُس کو خُوب معلوم تھا کہ خُدا کی اس طویل و عریض زمین میں بڑے بڑے شہر ہیں۔ یہاں تک کہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس بھی موجود ہیں اور یہاں کراچی بھی تو ہے وہاں ہی تو وہ آ کر اترا تھا۔ چینیوں کے محلے میں جا کر اس کو سکون سا معلوم ہوا تھا۔ چپٹے چہرے، گول آنکھیں اور چپٹی چپٹی ناکیں پست قد فربہی کی طرف مائل گٹھی گٹھی عورتیں چینی لباس میں خاموشی اور متانت سے کھٹ کھٹ چلتی ہوئی اور پھر تنگ تنگ سے فلیٹوں کے باورچی خانوں سے مچھلی، جھینگوں اور لہسن کی روٹی کی خوشبوئیں آتی ہوئی اور وہاں تو سب کچھ تھا بہت بڑا چینی ریستوران جس کے کھانوں کی فہرست میں اتنے نام تھے کہ اس نے چین میں رہ کر بھی نہ سنے تھے۔

"ارے وہاں عام لوگوں کو کب اتنے اچھے کھانے میسر آتے ہیں"! وہ ہمیشہ قناعت سے سوچا کرتا تھا۔ یہ تو بس اس طویل و عریض ملک کے لوگوں کا ہی حصہ ہیں۔ پھر بھی ان میں سے زیادہ تر کے چہروں پر بارہ ہی بجے رہتے ہیں۔ وہ جل کر حقارت سے منہ بناتا۔

خیر جو کچھ بھی ہو، کراچی اچھا خاصا شہر تھا۔ مگر اس کمبخت سانگ نے اس کو وہاں رہنے ہی کب دیا۔ چھ ماہ بھی نہیں گذرے تھے کہ وہ اس کو وہاں سے لے اڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں سے ملازم ہی رکھ کر لایا تھا، پر وہ اس کو کسی بہت بڑے شہر میں کیوں لے گیا۔

کراچی جیسے بڑے شہر میں جہاں چینیوں کے محلے ہوتے ہیں اور آدمی کو اتنی زیادہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر تیر سانگ کو تو یہی مختصر سا شہر پسند آیا تھا۔ جہاں سرے سے کوئی دوسرا چینی موجود ہی نہ تھا۔

اور اب وہ اس کی جوتے بنانے والی مشین پر کام کرتا تھا۔ ہفتے میں چار روز جوتے کی دکان پر سیلز مین کا کام کرتا اور دو دن سائیکل پر چینی دست کاری کے بے مثال نمونے لے کر سول لائن کے علاوہ مقامی رئیسوں کی کوٹھیوں کے چکر کاٹا کرتا۔

"چائنا مین، چائنا مین"۔ وہ بڑی مسخری سی موٹی اور مہین آوازیں نکالتا ہوا بنگلوں اور کوٹھیوں کے احاطوں میں اپنی سائیکل لے کر گھس جاتا۔ گھنٹوں برآمدوں کی میز صوفوں اور پورچ کی دیواروں سے ٹیک لگائے کھڑا پتلون کے پائنچے لپیٹ لپیٹ کر ان پر سفید سلولائڈ کا کلپ جمایا کرتا اور اندر سے بیگموں کو جھانکتے دیکھ کر سنبھل کر مودب لہجے میں دہراتا۔ "چائنا مین"

ذرا سے اشارے پر وہ اپنا بھاری بھر کم گٹھڑ دھم سے برآمدے کے چکنے ہوئے فرش پر پٹخ دیتا اور خود اس کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا۔ اور جب نفاست کے ساتھ ناک بھوں چڑھاتی ہوئی بیگمیں برآمدے میں پڑے ہوئے مونڈھوں پر آ کر بیٹھ جاتیں تو وہ اپنا گٹھڑ کھول کر چینی دستکاری کے بیش بہا نمونے ان کے قدموں میں بکھیر دیتا۔

پلنگ پوش، سلک کے نائٹ سوٹ اور ڈریسنگ گاؤن، میز پوش، ٹی کوزیاں، سامان کیا ہوتا۔ فائن آرٹ کی نمائش ہوتی۔

دل ہی دل میں اس صنعت اور دست کاری کی قائل ہوتے ہوئے بھی وہ اس سے کہتیں۔ "ہٹاؤ کیا اٹھ رہے ہو بے کار ہے یہ پلنگ پوش تو ۔۔۔ اوئی! اس سٹ میں کیا رکھا ہے جو اس کے دس روپے مانگ رہے ہو؟"

وہ اس سے دام کم کرنے کو کہتیں اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی تر چھی آنکھیں جھپکا جھپکا کر پیسے پیسے کے لئے جھگڑتا۔ وہ جھگڑتا تو سہی لیکن اس کی آنکھیں اور لب مسکراتے رہتے۔ وہ بڑی خوش مزاجی سے ان کی ہر بات کے جواب دیئے جاتا۔

"لو بھلا اس پٹی کوزی کے تین روپے! میں ہرگز نہیں دوں گی۔ ایسی کیا بات ہے اس میں؟"

"مت دو! ایک بھی مت دو" وہ آنکھیں سکیڑ لیتا۔ "مگر اس میں بہت بہت بکت۔ ہمارا عورت لوگ کو بہت آس آس اس سے بناتا ہے" ، محنت کا لفظ اس کو یاد نہ آتا اور وہ مسخروں کی طرح ہاتھ ہلاتا۔

"کیا محنت لگتا ہے؟ کچھ نہیں ارادے کا کام ہے۔"

"ہاں بیگم صاحب! وہ سلے کا کام ارادے کا معلوم ہوتا"۔ وہ ان کو دھمکانے کے خیال سے چیزیں لپیٹ لپیٹ کر اور باندھ باندھ کر رکھنا شروع کر دیتا۔ اور جب ان کو متوجہ نہ دیکھتا تو ایک دم ایک آدھ روپیہ کم کر کے پوچھتا۔ اتنے کو دیگا؟ جھک جھک کر تو خوب ہوتی مگر کوٹھیوں میں مال بکتا ضرور۔

اور جب وہ اپنا گٹھر دوبارہ سائیکل پر لادتا تو یہ سوچ کر اس کا دل کڑھ کر رہ جاتا کہ یہ بیگم لوگ اس کی چیزوں کو معمولی اور نکما جانتی ہیں۔ ان کو کیا معلوم یہ چیزیں اس کے نزدیک کتنی پیاری اور بے بہا ہیں۔ یہ اس کے ملک کی فاقہ کش عورت کی دستکاری ہیں۔ جن کو سخت محنت اور دیدہ ریزی کے بعد بھی شکم سیری نصیب نہیں ہوتی۔ کپڑے اور ریشم سے بنائے

ہوئے ان شگوفوں، پھولوں اور دریاؤں، کشتیوں اور معبدوں سے اُس کو کتنا جذباتی لگاؤ ہے وہ کیا جانیں۔ وہ جب اُن سب چیزوں کو بکھیر کر ان کے درمیان بیٹھتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا کہ قدیم اور مہذب چین کا سارا ماحول کلچر اور تاریخ اس کے ارد گرد بکھری ہوئی ہے اور خود وہ ان سب کے درمیان مقدس بدھ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ بھی ایک بہت سرد دن کا ہی واقعہ ہے۔ اُس دن صبح ہی سے سانگ اُس پر ناراض تھا۔ وہ دکان کے عقبی حصے میں بیٹھا ہوا چمڑا کاٹنے والی مشین پر کام کر رہا تھا۔ اور سانگ کے فضیحتے بھی خاموشی سے سن رہا تھا۔ ان دو ہفتوں میں اُس نے جو عرف عام میں صفدر یاسین کے نام سے مشہور تھا، پھیری کے سلسلے میں سانگ کو ایک پیسہ بھی لاکر نہ دیا تھا۔ پھر سانگ کو غصہ کیوں نہ آتا۔

"اس حرام خوری کے کیا معنی؟" وہ ایک چھوٹی اور نیچی سی چوکی پر گوتم بدھ کے اسٹائل میں آسن جمائے بیٹھا تھا۔ اُس کا پست قد، فربہ جسم، ساٹن کے سیاہ چغے میں چھپا ہوا تھا۔ جس کے داہنی طرف ایک قدیم داستان عشق کڑھی ہوئی تھی۔ اور اس منظر میں بید مجنوں کے پیچھے ٹینگ تائی چنے ہم کتب 'اشان یو' سے رخصت ہوتی دکھائی گئی تھی۔

سانگ کا موٹا اور سرخی مائل تھل تھلا جسم ہل رہا تھا۔ اس کا پیٹ لٹکے ہوئے سینے کے گوشت کے درمیان ایک مدور ٹیلے کی طرح نمایاں اور ابھرا ہوا تھا۔ سیدھی اور سیاہ مونچھیں کیکڑے کے ڈنکوں کی طرح ٹھوڑی کے دونوں طرف بے بسی سے لٹک رہی تھیں۔ سانگ کی ساری بک جھک کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ وہ نرا نکما اور کام چور ہے۔ جنگلوں پر جانے سے گھبراتا ہے، ورنہ کیا وجہ ہے جو اس کا سامان نہ خریدا جائے۔ "فضول باتوں سے فرصت نہیں"۔ سانگ کو دراصل سارا رونا اسی بات کا تھا کہ ذرا آنکھ بچی اور خالی وقت میں صفدر کا برش چلنے لگا۔ بلک کے ٹکڑوں، سفید بانس کی پتلی پتلی چلمنوں پر اور کچھ نہیں تو چاول کے

رنگ برنگ آٹے کو گوندھ گوندھ کر اس کی چیزیں بنانے بگاڑنے میں صفدر کا سارا وقت ضائع ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ مشغلے رات گئے سے پہلے کبھی بھی شروع نہ ہوسکتے تھے۔

"اس ماہ کے بعد تمہارا حساب کروں گا۔ پھر تم جانو اور تمہارا کام" وہ تقریباً ہر ماہ کے وسط میں یہی دھمکی دیتا۔ حالانکہ حساب کتاب کرنے کا خیال دور دور تک نہ ہوتا۔ صفدر جیسا لاوارث اور محنتی نوکر اور اس پر بے غرضی اور گھنا پن۔ کچھ کہہ لو مجال ہے جو منہ سے جواب نکل جائے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ ذرا دیر میں سانگ کے بہی کھاتوں کا حساب ٹھیک کر دیا کرتا تھا۔ جس میں سانگ تقریباً کورا تھا۔ اور وہ یہ سارے کام ایک معمولی سے مشاہرے کے عوض خوشی خوشی یوں کر دیتا تھا کہ سانگ نے اس کے کھانے پینے کا انتظام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ہر دوپہر کو سانگ کی خاموش طبع بے اولاد بیوی چھوٹی سی چوکی نما میز پر پیالہ بھرے ہوئے چاول، جھینگوں کا شوربہ، مچھلی یا بانس کے کلوں کا شوربہ اس کے سامنے رکھ دیا کرتی تھی اور جب وہ چکنی اور سفید تیلیوں سے اڑا اڑا کر چاول کے لقمے منہ میں بھرتا تو وہ قریب بیٹھی بڑی توجہ سے اس کو کھاتے دیکھا کرتی اور سانگ کی نظر بچا کر پیالہ خالی ہونے سے پہلے ہی دوبارہ چاولوں سے بھر دیا کرتی۔

وہ اس کے قریب بیٹھی ہوتی تو اس کو ایسا لگتا جیسے وہ اس کی ماں ہو اور اس کو کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہی ہو۔ بس یہی ایک چیز تھی جس کے سہارے وہ سانگ کی بری بھلی باتیں بھول کر بچوں کی طرح بیٹھا خوشی خوشی کھانا کھاتا رہتا۔

سانگ کی بیوی دوسری چینی عورتوں کی نسبت قدرے دراز قد تھی۔ اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس کی زردی مائل جلد میں سے جا بجا سرخی رنگت جھانک رہی تھی۔ بادامی آنکھوں کے گرد حلقے گہرے سرمئی تھے اور دائیں رخسار کی ہڈی کے پیچھے والے حصے میں سے دو بال نیچے کو لٹک آئے تھے۔ بالوں میں سفیدی کی بجلیاں سی کوند رہی

تھیں۔ اُس کا چہرہ خاموش اور افسردہ سا تھا۔ لیکن اس کی چال تھی کہ غضب جیسے کوئی پانی پر بہتا چلا آ رہا ہو جیسے ہر قدم پر رقص کی چھما چھم سنائی دے رہی ہو جیسے پائل سے بج رہے ہوں۔

"یہ سانگ کی بیوی تھوڑی ہے۔ یہ تو اس کی داشتہ ہے۔" ایک نامعلوم رشتے کے اعتبار سے سانگ کا بھتیجا لیانگ چپکے چپکے اُس کو بتایا کرتا۔ "یہ تو اپنے وقت کی نامی رقاصہ تھی۔ بجلی تھی بجلی۔ اور سانگ کی اپنی بیوی اور متعدد داشتائیں تو اس کے وطن میں موجود ہیں۔ ایک بڑی سی چار چار صحنوں والی حویلی میں جس کے پائیں باغ میں شیر دہاں فوارے پانی اُگلا کرتے ہیں اور چوبی ستونوں میں بڑی نفاست اور باریکی سے لپٹے ہوئے اژدھے پھنکاریں مارتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ داشتائیں اور بے حد موٹی بیوی سارا دن اُوٹ پٹانگ قسم کی مصروفیتوں میں لگی رہتی ہیں۔

لیانگ کے نزدیک اس سے زیادہ اہم کوئی اطلاع نہ تھی اور صفدر کے نزدیک یہ سب سے غیر اہم بات تھی۔

آج بھی جب سانگ، صفدر پر بک رہا تھا تو لیانگ بظاہر تو جوتے سینے والی مشین پر کام کر رہا تھا لیکن دراصل وہ منتظر تھا کہ سانگ اُٹھ کر پیچھے فلیٹ میں جائے تو وہ داشتاؤں والی بات چھیڑے۔ مگر صفدر نے اس کا موقع نہ دیا۔ وہ مشین چھوڑ کر اُٹھا۔ اسٹور میں سے اپنا مفلر اُٹھایا اور سائیکل پر جا بیٹھا۔ گرم چاکلیٹ رنگ کی پتلون کا پائینچا موڑا اور اُس میں کلپ لگا دیا۔ پھر سائیکل کو زور سے دھکیلا اور وہ بیٹر کول کی نسبتاً خاموش سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ یہ سڑک آج خاموش تھی اس لئے کہ آج اتوار تھی اور دن سرد۔ صفدر کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس لئے کہ "وہ آج غیر مطمئن تھا اور غمگیں بھی"۔

اور جب وہ اداس اور غمزدہ اس پہاڑی ڈاک بنگلے جیسے مکان کے پھاٹک کی طرف دیکھے بغیر ہی آگے بڑھ گیا تو باغ کی نیچی سی دیوار پر سے منہ نکال کر مالی نے اس کو آواز دی۔ "اے بچیّا! ادھر آئے گا؟"

بچیّا رکا اور سائیکل پر چڑھے چڑھے ہی دیوار کے قریب آکر بولا "کیا آئے۔ اتنی دفعہ تو آ کر گیا ہے۔ بیر اُلو کا بچہ بولتا ہے۔ بچیّا شور مت کرو بیگم لوگ سوتا ہے ہم پوچھتا تمہارا بیگم لوگ سارے کیا سوتا ہے۔"

مالی ہنسا اور اس کے سر پر گرہ دی ہوئی چوٹی بھی ہنسی۔

"اس ٹیم تو جاگ رہا ہے بچیّا اندر چلے جاؤ وہ ہم کو کئی بار بول چکی ہیں کہ ذرا بچیّا کا دھیان رکھنا۔"

پھر اور رازداری میں گردن بڑھا کر بولا "بٹیا کی سادی ہونے کو ہے نا۔ اس کارن روج تمہاری راہ دیکھتی ہیں۔"

"سادی ہونے کو ہے تو ہمارا راستہ کیوں دیکھتا ہے۔ ہم کیا دولہا ہے۔" صفدر نے معصومیت سے آنکھیں جھپکائیں۔

"چل دور ہو مسخرا کہیں کا۔ جاؤ اندر خوب بکری ہو گی بٹیا بڑے گھر جائے رہی ہے خوب چیز سے کر جائے گی۔"

وہ سائیکل سے کودا اور کتھڑ کے بھاری بوجھ سے دبی ہوئی سائیکل کو گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اور غسل خانے کی کھڑکی کے قریب جا کر پورے زور سے آواز لگائی۔ "چاچا میں، چاچا نانٹی" ہر طرف حسب معمول سناٹا تھا۔ تیسری آواز کے ساتھ ساتھ وہ مایوسی سے مڑا کہ غسل خانے کی کھڑکی کھلی ایک رانیوں کا سا باوقار اور معمر چہرہ جھانکا اور انتہائی نرم لیکن پُر رعب انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

لے! تم چل کر برآمدے میں بیٹھو ہم ابھی آتے ہیں۔"

اجازت ملتے ہی اُس نے تیزی سے برآمدے کا رخ کیا اور دھم سے گھٹنے گرا اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے سے سُرخ اور سیاہ گوٹ والا لہنگا اور چھنسی چھنسی آستینوں کی چولی پہنے اور نیلی چنری اوڑھے، دلن چھم چھم کرتی گزر رہی تھی صفدر کا دل مچل کر رہ گیا۔ کاش اُس کے سامنے بہن کی سفید اور نازک تلیوں والی چٹائی اور ہاتھ میں بُرش ہوتا تو وہ اس ادھیڑ عمر کی اس محنت کش عورت کے وجود کی ساری تڑپ اور طنطنے کو پکڑ لیتا اور اس کی تیلیوں میں مقید کر لیتا۔ پر اُس کے مقدر میں تو ان مغرور اور بدوماغ چیلوں سے سر مارنا لکھا تھا۔

گیلری کا دروازہ کھلا۔ تمتمایا ہوا چپٹا چہرہ جھانکا۔ بادامی وضع کی ترچھی آنکھیں جن میں بُخار کی چمک صاف نمایاں تھی۔ چیخیں اور آواز آئی۔

"چھن چھن چاؤ میں"

"سل بے بی! ادھر آؤ"۔

چپٹی مگر دل کش لڑکی دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔

لیکن وہ جان بوجھ کر بے نیاز بنا بیٹھا رہا پھر وہ دبے دبے قدموں سے اُس کے قریب آ گئی "" ہاؤ "ایک دم منہ بڑھا کر صفدر نے اسے ڈرا دیا۔

"بد تمیز" وہ ایک دم تمکنت سے بولی۔ "لاؤ اپنا سامان دکھاؤ"۔

"بھاگ جاؤ موٹی لیفٹننٹ! تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ بُرا مان کر مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اور وہ یوں بھی بہت دلچسپ نظر آ رہی تھی جیسے اپنے ہی گھر کی کوئی بچی ہو۔

"اپنا نام بتاؤ؟"

گڑیا نے اپنا منہ پھیر لیا۔

"بس ہو گیا! چلو ہم معافی مانگتا۔ بولو تم کیا سامان مانگتا؟" ایک نامعلوم تبسم اس کی آنکھوں میں اور لبوں پر بکھر کینے لگا مگر وہ بڑی متانت سے ضبط کی پوری کوشش میں لگی رہی۔

"ہمارا بے بی نہیں۔ اب اپنا نام بولو۔ پھر ہم تم کو چاکلیٹ دے گا۔"

"میرے پاس خود چاکلیٹ ہے!" وہ اترائی۔

"پھر نام بولو!"

"ہمارا نام گیتی آرا بیگم ہے۔"

انجنی ویس کا تو عمر بھر کا بارا وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"بد تمیز کہیں کا پاگل نہیں تو"۔

گیلری میں ایک بار پھر سرسراہٹ ہوئی اور چکن کی ساری اور سفید وائل کے بلاؤز میں خوب صورت اور غصیلی آنکھوں والی بیگم نمودار ہوئیں۔ اور گیتی سے مخاطب ہوئیں۔

"تم پھر نکل آئیں چلو جا کر لیٹو۔" ان کے چہرے پر شدید ناگواری کے آثار تھے۔

چائنا مین بلاوجہ ہی دب گیا اور دبے ہوئے لہجے میں بولا "سلام بیگم صاحب!" اور اپنا گٹھر کھولنے لگا۔

وہ پھر لڑکی کی طرف مڑیں۔ "سنا نہیں تم نے چلو اندر اور چچی جان سے کہو کہ یہاں آکر سامان دیکھ لیں۔"

"میں بھی سامان دیکھوں گی!" اس نے گھٹے اور سرکش لہجے میں جواب دیا۔

"ہرگز نہیں تم ایک منٹ یہاں نہیں ٹھہرو گی۔ کیا بازار میں بھی مار کھانے کا ارادہ ہے؟" انہوں نے کہہ دیا چلی جاؤ اندر۔

"چلی جاؤ اندر!"۔ موٹی اور گستاخ لڑکی نے نفرت اور سرکشی سے ماں کی بات دہرائی۔ اور سر جھکائے اندر چلی گئی۔

سلک کے نیلے چار خانے کے شب خوابی کے لباس میں وہ اور بھی چینی نظر آرہی تھی صفدر کو گھر کی یاد پھر ستانے لگی اور اس کا دل بلاوجہ ہی غمگین ہونے لگا۔

بیگم مونڈھے پر بیٹھی ادھر ادھر سے چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں، چہرے پر کسی قسم کا تحسین آمیز تاثر نہ تھا۔ اگر ان کے سامنے سبزی ترکاری یا گیہوں کا ڈھیر بھی ہوتا تو وہ اس کو یوں ہی الٹ پلٹ کر دیکھتیں اور بھویں چڑھائے رہتیں۔

"اہل نظر تو سبزی ترکاری کے حسن پر بھی لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔"

یہ فقرہ صفدر نے خاص چینی زبان میں سوچا تھا۔

کھس کھس کی آواز نے اس کو پھر دروازے کی طرف متوجہ کر دیا۔ اکہرے جسم، سجیلے نقش و نگار اور افسردہ شخصیت والی چینی جان نمودار ہوئیں اور اپنی جھنجلاہٹ سے دو قدم پیچھے اسٹول پر بیٹھ گئیں۔ ان کا رنگ سانولا اور آنکھیں خاموش تھیں۔ ساس کی سفیدی میں بڑی مجبوری سی بے بسی تھی۔ بیگم ہر چیز کے متعلق ان سے رائے طلب کر رہی تھیں اور ان کی کوئی انفرادی رائے نہ تھی۔ صفدر کا چلتا ہوا دماغ منٹوں میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ پورچ میں ایک بڑے مہذب اور دبے ہوئے ہارن کی آواز آئی۔ موٹر کا دروازہ کھلا اور احتیاط سے بند کر دیا گیا۔ سرخ کنارے کی سفید ساری اور نرم کھادی کے بلاؤز میں ایک لڑکی اتری اور برآمدے کی طرف مڑی۔ اس کے ہاتھ میں دو ایک کاپیاں تھیں۔ بلاؤز کے گلے میں سے قلم کی سنہری پن جھانک رہی تھی۔ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح روشن اور پرسکون تھا سنہرے اور روکھے بالوں کی موٹی اور گھنی سی چوٹی کمر سے نیچے اوپر رک گئی تھی۔

"اے لو! صولت خود بھی آ گئیں۔ بس بس تمہارا ہی انتظار تھا" بیوہ چچی افسردہ سی شوخی سے مسکرائیں۔

صولت کی لمبی اور سیاہ پلکیں جھکیں تو وہ اور بھی دلچسپ نظر آنے لگی۔

"اچھا تو اس بی بی کا ساری بتائے گا۔ بیگم صاحب!"۔

"اے لو۔ اس مردوے کو یہ بھی خبر ہے۔" چچی نے دلچسپی سے اُس ذہین لڑکے کی طرف دیکھا جو عام چینیوں سے خاصا مختلف تھا۔ اُس کی رنگت میں میٹرک کے پیپٹ کا سا پیلا پن نمایاں تھا۔ ناک کا بانسہ بھی خاصا اونچا تھا۔ اور بالوں میں بڑی خفیف اور نامعلوم سی لہریں تھیں۔ بیگم نے اُس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔

"آج تم نے بڑی دیر کر دی۔؟"۔

"جی ذرا اپلی نے اُس کو اُبھارا تھا۔"

"کس کو؟" نگاہوں میں قہر تھا۔

"ثریا کو۔"

"مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔ ثریا لیلی کہاں کی موٹروں میں گھٹنے والی ہو گئیں۔ کیوں؟ ان کی سائیکل کہاں گئی؟ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ گھنٹہ گھنٹہ بھر گاڑی تمہاری ڈیوٹی میں رہے۔ لو ذرا یہ نائٹ سوٹ تو پہن کر دیکھو۔ تمہارے ٹھیک آتا ہے؟"۔

لڑکی نے حیرت اور ناگواری سے اس کو دیکھا۔

"میں کہتی ہوں تمھاری عقل کو کیا ہوتا جارہا ہے؟ میرا منہ کیا تک رہی ہو؟ ڈریسنگ روم میں جا کر پہن آؤ"۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ نکلی۔ لٹھے کا سفید ڈھیلا ڈھالا چکن کا کرتا اور پھنسا ہوا پیازی دوپٹہ۔ ہاتھ میں نائٹ سوٹ لئے وہ اپنی چچی کے قریب بیزار اور شرمائی سی آکر کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے"۔ اور نائٹ سوٹ اُس نے بکھرے ہوئے کپڑوں پر ڈال دیا۔

"خاک ٹھیک ہے! اسے ذرا دیکھنے تو دیا ہوتا۔ تم کو کوئی اندازہ ہے کسی بات کا!"

"ارے ماں! ٹھیک ہے میں یہاں کہاں پھنس کر آ گئی۔"

انہوں نے انتہائی غصے سے بادامی سلک کا نائٹ سوٹ پھر سے اٹھایا اور بولیں "چلو میرے ساتھ مجھے گھر دکھاؤ"

گیلری میں جاتے جاتے انہوں نے اس کو کچھ کہا "میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ہر چیز سے بیزار ہوتی جاتی ہو۔ کوئی چیز بھاتی ہی نہیں!"

صفدر کے کان تیز تھے اور وہ بہت چالاک تھا۔ وہ بچی سے راز داری میں بولا۔ "تمہارا لڑکی کا ساوی کدھر ہو گا؟"

"افسر ہے بہت بڑا۔ فوج میں ہے بہت بڑا آدمی ہے۔"

"او تیرہ! کتنا بڑا؟ ہاتھی کے برابر؟ افسر ہے تو اس کا رینک بتاؤ؟"

"اب تم کو کیا پتا نہیں۔ اچک ہو تم تو۔"

"ہم کو سب پتہ ہوتا ہے ہم آسمان کا رہنے والا تھوڑا ہے"۔ وہ خوب سمجھ گیا تھا ان دوسری بیگم کا لالا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

"وہ لیفٹیننٹ کرنل ہے اور اس کی بہت سی زمینیں ہیں۔"

"تو یہ کہو کہ بڑھا آدمی کے ساتھ ساوی بنائے گا؟"

"کیوں بڑھا کاہے کو ہو گا! یہ پلنگ پوش کتنے میں دو گے؟"

انہوں نے بات ٹالی۔

"تو اور کیا کوئی بچہ لیفٹیننٹ ہو جاتا ہے۔"

"اے دیکھو تو کتنا دلیلیا ہے یہ تم خاک بیچتے ہو گے ہم تم سے پلنگ پوش کی قیمت پوچھ رہے ہیں اور تم الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ یہ بڑا کو اور ساتھ میں چلو کیس تو نئی فول لو پی

کا ہے لے گا؟" اس نے بدلحاظی سے پلنگ پوش ان کی طرف اچھالا ہی تھا کہ بڑی بیگم ہاتھ میں سلک کا ڈوبی نائٹ سوٹ اُٹھائے واپس آ گئیں۔

"اس کی فٹنگ ہمیں پسند نہیں۔ تم ہم کو دوسرا اس ناپ کا نہیں دے سکتے ؟

"انھوں نے کاغذ پر لکھا ہوا ایک سائز دیا اور مونڈھا سنبھال لیا۔

صولت آہستہ سے برآمدے میں آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور بھیگی بھیگی تھیں۔ روکھے روکھے بال روشن پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھر رہے تھے۔

وہ آئی اور دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اس کی ماں نے بے تعلق اور بے زار چہرے کی طرف دیکھ کر تنبیہ تھوڑا اور وہ سنبھل گئی۔

اس دن صفدر یاسین نے بہت سی چیزیں بیچیں اور بہت سی چیزوں کا آرڈر لیا۔ اپنا گٹھڑ باندھا اور سائیکل پر لاد کر سیٹی بجاتا ہوا نکل گیا۔ گیٹ کے قریب بڑی بڑی معصوم آنکھوں اور موٹی موٹی بھوری چوٹیوں والی لڑکی کھڑی ہوئی چپکے چپکے کچی نارنگیاں کھا رہی تھی۔ چاچا یٰسین کو آتے دیکھ کر اس نے نارنگیاں چھپائیں اور معصومیت سے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے نوٹس ہی نہ لیا اور آسمان کی طرف تاکتا آگے چلا گیا۔

امراؤ طارق-(1932-2011)

امراؤ طارق برطانوی ہندوستان میں فتح پور چوراسی اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا تعلق ایک زمین دار گھرانے سے تھا۔ امراؤ طارق کا اصل نام سید امراؤ علی تھا۔ 1948 میں حیدر آباد دکن کے بھارت میں ضم ہو جانے کے بعد امراؤ طارق وہاں سے ڈھاکہ چلے گئے۔ 1952 میں وہ ڈھاکہ سے کراچی منتقل ہوئے، جہاں ان کے خاندان کے کئی لوگ ہجرت کر کے پہنچے تھے۔ کراچی میں انہوں نے پولیس کے محکمے میں ملازمت کی اور ڈی ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

امراؤ طارق کی پہلی کہانی برگ گل نامی رسالے میں 1954 میں شائع ہوئی۔ ان کا پہلا افسانوں کا مجموعہ "بدن کا خواب" 1979 میں شائع ہوا۔ اس کتاب نے آدم جی ایوارڈ حاصل کیا۔ اس کے علاوہ ان کے دو مزید افسانوں کے مجموعے "خشکی پر جزیرے" اور "تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے" شائع ہوئے۔ ان کا ایک ناول "معتوب" بھی شائع ہوا۔ جسے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی۔ اس ناول کے چند صفحات اس انتخاب میں شامل کیے گئے تھے۔

"معتوب" 1995 میں منظر عام پر آیا تھا۔ موضوع کے ساتھ ساتھ اپنی تکنیک کی بنا پر بھی اسے ایک اہم اور فکر انگیز ناول قرار دیا گیا تھا۔ موضوعی طور پر اس میں عہد حاضر کی دگرگوں سیاسی اور سماجی صورت حال کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں ایک خاتون ایک پادری کے سامنے پیش ہو کر اسے اپنے اعترافات سننے پر مجبور کرتی ہے۔ اس اعتراف کی مدد سے اس خاتون کی زندگی کے حالات و واقعات کے علاوہ اس کی امروز سے ملاقات اور پھر امروز کے پر اسرار قتل کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس طویل اعترافی

یہاں پر ناول کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں عالمِ ارواح سے امروز کے مکالمے کے ذریعے اس کے پس منظر اور خاتون سے اس کے تعلق اور اس کے قتل پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ تیسرے حصے میں پادری کے توسط سے قتل کا مقدمہ عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں پادری کی کردار کشائی کے ساتھ عدلیہ کی ابتر صورت حال پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ عدالت میں ہونے والے بم دھماکے پر یہ ناول ختم ہو جاتا ہے۔

اس ناول میں ایک عورت کے کردار کو مرکزیت حاصل ہے، لیکن پورے ناول میں کسی بھی مقام پر اس کا کوئی نام تحریر نہیں کیا گیا ہے۔ یوں ایک عورت کو اس کی بے نام حیثیت سے پیش کر کے مصنف نے عورت کی مزاحمت کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔

معتوب

سال اشاعت: 1991

اسرار طارق

وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں اور انہوں نے غوطہ خور سمندر میں اتار دیے ہیں جو جگہ جگہ غوطے لگا کر میرے جسم کو سمندر کی گہرائیوں سے نکال لینا چاہتے ہیں۔ تین چھوٹی چھوٹی ماہی گیری کی کشتیاں جن کو غوطہ خوری کہتے ہیں سارے سمندر کو کنگھالتی پھر رہی ہیں اور بہت سے غوطہ خور چاروں طرف میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور طویل غوطے لگا کر پھر سطح پر ابھرتے ہیں اور تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھ کر اپنے حصے کے رقبے کا اندازہ لگا کر پھر لہروں کے نیچے ڈوب جاتے ہیں۔ ساحل پر پولیس کی بھاری نفری، مسلح گارڈ اور کئی موبائل پولیس گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ وہ پولیس کے ایک سینیئر افسر کے ساتھ کھڑی ہوئی سمندر کی لہروں کو مسلسل دیکھے جا رہی ہے اس کے خوبصورت لمبے بال اس کی پشت پر کمر کے نیچے ہوا سے باغی جھنڈے کی طرح لہرا رہے ہیں اور سامنے کی چھوٹی لٹیں بار بار چہرے کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اس وقت بھورا ہے اور جب اس کی آنکھوں کا رنگ بھورا ہو جائے تو اس کے دل میں اتر کر جھانک لینا ناممکن ہو جاتا ہے پھر اس سے کچھ بھی معلوم کر لینا ممکن نہیں رہ جاتا اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے اپنے دل میں اتر جانے والی نظروں کے آگے سنگلاخ پتھروں کی بھوری فصیل اٹھا دی ہے۔ یہ بھوری فصیل بارہا میرے سامنے آ چکی ہے میں اس فصیل کو تاریکی میں بھی دیکھ لیتا ہوں اس فصیل کی موجودگی میں سارے سوال بے معنی ہو جاتے ہیں اور کچھ جان لینے کی ساری خواہشیں دم توڑ دیتی ہیں اور وہ خود پتھر کی ہو جاتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر اس وقت لپ اسٹک لگی ہوئی نہیں ہے اس لئے ان میں سچائی کا رنگ جھلک

رہا ہے یہ ہونٹ جب لپ اسٹک سے پاک ہو جاتے ہیں تو یا قوتی کہتے ہیں یا بند رہتے ہیں۔ اس وقت ان ہونٹوں کو دیکھنے سے یقین آرہا ہے کہ اسے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی اور اب سارے سوال فضول ہیں اور سرد کی گفتگو عبث ہے اب اس سے مزید کچھ پوچھنا اسے طیش دلانے کے مترادف ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد خوبصورت حلقے اس کی نقاہت کے باعث زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں اور پلکوں کی سیاہی گلابی ہو گئی ہے اس کا چہرہ ستا ہوا ہے مگر تاسف کا کوئی سایہ چہرے پر نہیں ہے۔ تاسف کا کوئی سایہ میں نے کبھی اس کے چہرے پر پہلے بھی نہیں دیکھا ہے اور اسی تاسف کی عدم موجودگی کے باعث ہر اس شخص کی نفی ہو جاتی ہے جسے وہ پسند نہیں کرتی یا خاطر میں نہیں لاتی۔ اس کی لمبی خوبصورت انگلیوں پر نیل پالش اب بے رنگ ہو چکی ہے اس کی انگلیوں پر صبح کی نیل پالش ہمیشہ شام کو باسی ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ اور انگلیاں اس قدر خوبصورت ہیں کہ کیوٹیکس زیادہ دیر تک اپنی تازگی برقرار نہیں رکھ سکتی اور باسی کیوٹیکس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کا حسن ماند پڑ گیا ہے۔ ساحل سمندر کی ریت نے اس کے سینڈل اور اس کے پیروں کو ڈھانپ رکھا ہے مگر میں ریت میں چھپے ہوئے ان پیروں کی خوب صورتی کبھی فراموش نہیں کر سکتا اس کے پیروں کی سب نے ہمیشہ تعریف کی ہے۔ پولیس افسر اب بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے ڈش ملنے کی امید کم ہوتی جا رہی ہے۔ غوطہ خور پانی سے نکل کر ایک ایک کر کے خشکی پر آنے لگے ہیں اور ہوڑیاں سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آگئی ہیں ان کا رخ اب ساحل کی طرف ہو گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہوڑیوں اور غوطہ خوروں نے وہ سارا رقبہ چھان لیا ہے جس میں لاش کا مل جانا ممکن تھا۔ وہ بھی ساحل پر کھڑی چپ چاپ غوطہ خوروں اور ہوڑیوں کو دیکھتے ہوئے منتظر تھی کہ کسی لمحے کوئی غوطہ خور یا کوئی ہوڑی کامیابی کا اعلان کر دے گی اور سب اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور چند لمحوں میں لاش خشکی پر لا کر ڈال دی جائے گی اور سارے غوطہ خور پولیس

افسر اور ماہی گیر اپنی کامیابی پر خوش ہوں گے۔ اس نے ہوا کے تیز جھونکے سے اپنے لباس کو سنبھالا اور دوپٹے کو پھندے کی طرح گلے میں لپیٹ لیا اور پھر غوطہ خوروں اور بوڑھے ماہی گیروں کو دیکھنے لگی جو گھٹنوں پانی کے اندر رہنے کی وجہ سے بھیگے ہوئے چوہوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

"کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ یہ جگہ وہی ہے"۔ پولیس افسر نے اس سے سوال کیا۔

"میں یقین سے اب کچھ نہیں کہہ سکتی"۔

"کیا یہ جگہ وہی ہے؟!"

"میرا جگہوں، انسانوں، نظریوں اور جذبوں پر اب کوئی یقین نہیں رہ گیا۔ میں نے پہلے بھی بتا دیا ہے کہ وہ صبح کاذب تھی ابھی اجالا نہ پھیلا تھا اور میں اپنے ہوش و حواس گم کر چکی تھی اور جلد سے جلد سمندر کے قریب پہنچ جانا چاہتی تھی۔ میں کار بالکل ساحل کے قریب لے گئی تھی اتنے قریب کہ سمندر کی لہریں کار کے پہیوں کو بھگو کر دور تک چلتی چلی جاتی تھیں اور میں حیران تھی کہ کار یہاں تک کیسے آ گئی اور لہریں کار کو بہا کیوں نہ لے گئیں"۔

"لیکن اب یہاں کار کے پہیوں کا کوئی نشان نہیں ہے" پولیس افسر بولا۔

"سارے نشان مٹ جاتے ہیں صرف بات کا گھاؤ کبھی نہیں بھرتا۔ کوئی نشان لہریں اپنے ساتھ لانے والی ریت سے مٹا دیتی ہیں کچھ نشان گزرنے والوں کے قدموں کے نشانوں سے مٹ جاتے ہیں اور کچھ نشان موجود ہوتے ہیں اور بھیگی ریت سے بھر جاتے ہیں اس لئے ہمیں نظر نہیں آتے۔ ہاں بات کا زخم نہ بھیگی ریت بھر سکتی ہے اور نہ خشک معذرت، نہ مرہم کے پھائے سے بھرتا ہے اور نہ محبت کے بول سے۔ یہ زخم تو شیشے میں پڑے بال کی طرح ہمیں لگا رہ

جاتا ہے اور پھر مٹنے نہیں پاتا، بھرنے سے نہیں بھرتا ہاں آئینہ خود ٹوٹ کر اس نشان کا وجود ختم کر سکتا ہے۔ باتوں سے لگے زخم کے نشان باقی رہتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ"۔

میری طرف سے دیکھو میں یہاں ہوں اس چٹان کی اوٹ میں، دو پتھروں کے درمیان، جہاں ساحل پر آئی خود رو جھاڑیوں نے جال سا بن دیا ہے۔ میں نے چیخ کر کہا مگر میری آواز پر کسی نے توجہ نہ دی۔ زندہ رہنے اور مر جانے میں کوئی بھی فرق تو نہیں ہے علاوہ اس کے کہ تمہاری آواز زندہ انسانوں کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ وہ تمہیں دیکھ نہیں سکتے اور تمہارے لمس کو محسوس نہیں کر سکتے میں اپنے جسم سے الگ زندہ ہوں اور ان لوگوں کے درمیان کھڑا ہوں جو اس کی اور پولیس افسر کی گفتگو سن رہے ہیں یہ گفتگو میں بھی سن سکتا ہوں۔ میں اس کے بہت قریب کھڑا ہوں اتنے قریب کہ میں اس کے کان میں کوئی بھی راز کی بات صرف سر جھکا کر کہہ سکتا ہوں۔ مگر اب میں اس سے راز کی کوئی بات کبھی نہ کہوں گا اس لئے کہ اس نے ہمیشہ میری راز سے اور بڑے اعتماد سے کہی ہوئی ہر بات اس طرح اپنے ارد گرد کے لوگوں کو خاص طور سے جمع کر کے کہی جیسے لوگ چیلوں کی طرف صدقے کے گوشت کی بوٹیاں ہوا میں اچھالتے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کی اچھالی ہوئی بوٹیاں دور دور تک اڑنے والی چیلوں تک پہنچ جائیں۔ اس نے میرے امانت کی طرح حوالے کئے ہوئے رازوں کو میرے خلاف اور اپنے حق میں اس طرح استعمال کیا کہ میرے دوست میرے دشمن اور اس کے دشمن اس کے ہم راز بن گئے لیکن اب میرے راز کی سماعت کے لئے اس کے کان بند ہو چکے ہیں اور میرا جسد اس کے رازوں کے بوجھ سے دبا میری لاش کے ساتھ دو پتھروں کے بیچ آئی جھاڑیوں کے نیچے سمندر کی لہروں پر ہچکولے کھا رہا ہے نہ ڈوبتا ہے اور نہ غوطہ خوروں کو نظر آتا ہے۔

میں اس کے جسم کی جانی پہچانی خوشبو محسوس کر رہا ہوں اس کے جسم سے اس کی اپنی خوشبو کے ساتھ ائی میت کی باسی مہک صاف محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے باسی اتنی میت کی خوشبو اجنبی لگ رہی ہے اس لئے کہ اس نے اپنے جسم پر لگا ہوا سینٹ بھی کبھی باسی نہیں ہونے دیا مگر یہ لوگ جس طرف سے میری لاش پڑی ہوئی ہے اس طرف دیکھ ہی نہیں رہے۔ خود خود پولیس افسر کو یقین دلا رہے ہیں کہ اس پورے رقبے میں لاش موجود نہیں ہے اور ہوزی کے ملاح چیخ چیخ کر اپنی محنت کے ضائع ہونے پر پولیس سے جھگڑے کر رہے ہیں اور میں اپنی لاش دیکھ رہا ہوں۔ پانی میں بھیگ کر میری کھال کا رنگ زردی مائل سفید ہو گیا ہے اور میری صورت بدل گئی ہے۔ مجھے قتل ہوئے اب کئی گھنٹے گزر چکے ہیں اور ان چند گھنٹوں میں جانے کیا کچھ ہو چکا ہے۔ ابھی چند گھنٹوں بعد میری صورت اتنی بگڑ جائے گی کہ میری شناخت ممکن نہ رہے گی اب میرا یہ احساس پختہ ہو گیا ہے کہ مرجانا زندہ رہنے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور تسکین بخش ہے۔

پولیس میری لاش کو چٹان کے نیچے دو پتھروں کے درمیان جھاڑیوں کے سائے میں چھوڑ کر واپس جا رہی ہے وہ بھی ان کے ساتھ ہے اور اب تک اس کی آنکھوں کا رنگ بھورا ہے اور اس کے بال ہمیشہ کی طرح اس کی پنڈلیوں کو چھو رہے ہیں۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ مجھے اس نے قتل کیا ہے میں تھک کر شل ہو گیا تھا اور مجھ پر لذت آمیز غنودگی غالب آ گئی تھی اور میں لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے اس سے بہت کچھ کہہ دیا تھا اور اپنے سینے میں بھرا غبار نکال دیا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ جسم کے تمام اعضا اپنی کہانی سننے والوں کو سنا دیتے ہیں اور جاننے والوں کو بتا دیتے ہیں۔ وہ اس وقت میرے بازو میں ہمیشہ کی طرح بیتے لمحوں کے تصور سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور تسکین کی سانسوں کا ترنم اس کے جسم سے ابل رہا تھا۔ اس کا تنفس میرے کانوں میں اپسراؤں کے فضا میں گم نغموں کی طرح

گونج رہا تھا۔ ایسے لمحوں میں بے لباسی اور دور سے آنے والی آوازیں بڑی خوشگوار لگتی ہیں۔ جسم کا کوئی حصہ جسم سے مس ہو جائے تو دوئی کا احساس نہیں ہوتا۔ کہیں بھی ہونٹ رکھ دو تو دوسرا جسم بھی ہونٹ بن جاتا ہے نہ اپنا وزن دوسرے پر بوجھ بنتا ہے نہ دوسرے کا وزن محسوس ہوتا ہے۔ کمنیاں بدن میں چبھنے کے بجائے پھول کی پتیوں کی طرح نازک لگتی ہیں اور جسم کو گدگداتی محسوس ہوتی ہیں دوسرا جسم بھی اپنا ہو جاتا ہے اور سارے میں ایک واحد یکائیت اتر آتی ہے اور کچھ نہ اجنبی رہ جاتا ہے نہ غیر ہوتا ہے۔ میں لیکن اندر بھرے ہوئے زہر کو اگلے جا رہا تھا۔

"تم نے ڈور کے دوسرے بھی آج چھوڑ دیئے جن کے سہارے تم اتنے برسوں سے میرے ساتھ چل رہے تھے"۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی اور مجھے یوں لگا تھا کہ اندھیرے میں کہیں کوئی سانپ پھنکار کر گزر گیا ہے میں نے ہاتھ بڑھا کر دیکھا وہ جا چکی تھی اور پھر مجھے غنودگی لے آئی۔

"تم اتنے کم عقل نہیں جو مجھے نہ سمجھ سکو۔" اس کی آواز اندھیرے میں سنائی دی تھی۔

"مجھے کسی نے بھی نہ سمجھا" اس کی آواز دور ہو گئی تھی۔

"میرے کاندھوں پر ضحاک بادشاہ کی طرح اُگے سانپوں کا ادراک کیوں نہ ہوا، میں ان سانپوں کی غذا کا سامان کرنے پر مجبور ہوں"۔ آواز بہت دور تھی۔

"لو یہ کہانی بھی آج ختم ہوئی"۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئی تھی۔

ہمیں ایسے لمحوں میں بے لباسی ہمیشہ اچھی لگتی تھی، لمحوں کی بے لباسی، تسکین کی بے لباسی، جذبوں اور جسموں کی بے لباسی۔ ہمارے کانوں میں پیار کے نغمے گونجا کرتے تھے جو کبھی اور لمحے اتنے سچے اور اتنے انمٹ نہ ہوتے تھے اس لمحے پیار کا بوند بوند ٹپکا ہوا شہد

سارے جسم کو جکڑ دیا کرتا تھا اور ہمارے اندر سے تکلیفوں کا زہر کشید کر لیا کرتا تھا۔ وہ اسی طرح اٹھی۔ میں نے اندھیرے میں اسے جاتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اس کی حساس چمکتی ہوئی جلد کو میں نے اندھیرے کے پس منظر میں صاف دیکھا تھا۔ اس کا متناسب جسم اندھیرے میں حرکت کرتا ہوا مجھے غنودگی میں بھی دکھائی دیا تھا۔ شاید غنودگی کا وہ لمحہ مجھ پر آسمانوں سے اترا تھا پھر میں نے اسے بیڈ روم میں واپس آتے نہیں دیکھا اور میرا رشتہ زندگی سے ٹوٹ گیا۔ رات کے دو بجے تھے اور اکتوبر کی تیسری تاریخ پر دو مکمل گھنٹے گزار آئی تھی۔

مجھ پر یہ راز اب پہلی بار کھلا ہے کہ زندہ رہتے ہوئے موت کا تصور جتنا بھیانک ہے مر جانے کے بعد زندگی اتنی ہی خوفناک محسوس ہوتی ہے۔ زندگی میں تو آنکھوں پر اتنے پردے پڑے ہوتے ہیں کہ سامنے کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے اور جس طرح نظر آتا ہے دراصل وہ وہ ہوتا ہی نہیں جو ہمیں نظر آتا ہے اور وہ اس طرح بھی نہیں ہوتا جس طرح ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہم ساری زندگی جھوٹ دیکھتے ہیں۔ جھوٹ سنتے ہیں جھوٹ سوچتے ہیں اور جھوٹ ہی بولتے ہیں موت کے بعد کل علم، کل روشنی اور کل کائنات تمہاری ہو جاتی ہے اور تم آزاد اور خود مختار ہو جاتے ہو اور تمہارے ارد گرد بیچ کے عود ان خوشبو کی لپٹیں اٹھنے لگتی ہیں۔

میں اپنی لاش کو سمندری کیڑوں اور ساحلی حشرات الارض کے حوالے کر کے ان کے ساتھ ہو لیا وہ سب خاموش تھے اور اب اس کی آنکھوں کا رنگ سبز ہونے لگا تھا۔ دلوں میں اتر جانے والی نگاہوں کے لئے اٹھائی ہوئی بھوری فصیل لاش نہ ملنے کے اطمینان نے گرانی شروع کر دی تھی۔ وہ سب ایک کار میں واپس جا رہے تھے۔

اس نے آپ سے کہا اور میں نے سنا۔

"میں امروز کی لاش گھسیٹ کر کار کی پچھلی سیٹ سے سمندر کی لہروں تک اسی جگہ لے گئی تھی۔ مگر اب وہ وہاں نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے۔ لاش کہاں جا سکتی ہے۔ شاید سمندر کی تند و تیز لہریں اسے کہیں دور بہا لے گئی ہوں گی یا شاید سمندری جانور نے اس کا گوشت کھا لیا ہو اور ڈھانچہ بہتا ہوا گہرے پانیوں میں چلا گیا ہو امروز تم مر کر بھی اپنی ہی من مانی کر رہے ہو۔ بے وفا"۔

"اس وقت لہروں میں کتنا جوش تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے چاروں طرف سمندر کی تند و تیز لہروں کے علاوہ کہیں بھی کچھ نہیں ہے نہ میں ہوں نہ امروز کی لاش ہے نہ زندگی ہے، نہ حرکت ہے چاروں طرف قبر کا اندھیرا موت کی آواز اور کافور کی بو اور خون کی گی ہے۔ سمندر ہر چیز کی نفی کر دیتا ہے۔ میں نے کار کی روشنی گل کر کے کار چلائی تھی اور کار لہروں کے قریب تک لے گئی تھی لیکن اب دن کے اجالے میں کچھ بھی دکھائی نہ دیا تھا۔ گزشتہ رات کس قدر خوفناک تھی وہ موت کی پرچھائیوں سے اٹی ہوئی اجنبی رات تھی۔ ایسی رات اس سے قبل دنیا پر کبھی نہ اتری تھی میں تنہا تھی میں نے ہزار ہا امروز سے کہا تھا کہ مجھے کبھی تنہا نہ چھوڑنا مجھے کہیں جانے نہ دینا۔ مجھے مضبوطی سے پکڑے رکھنا لیکن اس نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ مجھے کہیں اور جانے دیا اور اس کی گرفت مجھ پر کمزور ہو گئی اور میں اکیلی رہ گئی۔

میں نے جھوٹ کی فصل بوئی۔

میں نے تنہائی کے جنگل اگائے۔

میں نے بے وفائی کے کانٹے بوئے۔

میں نے خود غرضی کی جھاڑیاں پھیلائیں۔

اور امروز نے وہ فصل کاٹی ان جنگلوں میں بھٹکا اور اس کے پاؤں لہولہان ہوئے اور وہ مر گیا۔

دراصل یہ سب میں نے اپنی اصول تنہائی کے موڈ میں کیا تھا تاکہ میرے تمام دوست بلاروک ٹوک میری تنہائی شیئر کر سکیں اور میں ضحاک بادشاہ کی طرح اپنے کاندھوں پر اُگے سانپوں کو مطمئن رکھ سکوں۔

میں اس کی خودکاری میں شامل اس کے ساتھ چلتا رہا اب میں اس سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا اس سے بحث بھی نہ کر سکتا تھا اس پر اپنے غصے، رنج یا دل آزاری کا اظہار نہ کر سکتا تھا میری آواز اب اس تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ مر جانے والے زندوں سے نہ شکوہ کر سکتے ہیں نہ انھیں دلاسا دے سکتے ہیں۔

تم مجھے موردِ الزام ٹھہراتی ہو کہ میں نے تمھیں تنہا چھوڑ دیا ہے تم جھوٹ بولتی ہو کیا میں نے تمھیں چھوڑ دیا ہے۔ تم مردوں کو الزام دیتی ہو ان کا پیچھا کرتی ہو مردوں کو آواز نہ دو وہ تم سے کچھ بھی تو نہیں کہتے۔ میں نے چیخ چیخ کر اسے بتانا چاہا مگر میری آواز کسی نے نہ سنی۔

پادری انتھونی ولکاکس اب بہت تھک چکا تھا۔ پولیس کی بے سود تلاش کے دوران اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے اسے یقین تھا کہ امروز کی لاش پولیس کو ضرور مل جائے گی لیکن جب پولیس کے تمام غوطہ خور سمندر سے باہر آ گئے اور پولیس ناکام ہو گئی تو اسے بھی مایوسی نے گھیر لیا۔ اس کی فراہم کی ہوئی اطلاع پر پولیس نے اپنی کارروائی کی ابتدا کی تھی۔ فلیٹ کی تلاشی لی تھی، ملزمہ کو گرفتار کیا تھا اور اسے ابتدائی پوچھ گچھ کی تھی اور اس کی نشاندہی پر کئی غوطہ خوروں اور ہوڑیوں نے پوری تندہی سے سمندر میں لاش تلاش کی تھی مگر پولیس کو لاش نہ مل سکی تھی اس کے پاس اپنی اطلاع کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت نہیں تھا۔

اس نے فادر انتھونی ولکاکس کی موجودگی میں خود ہی پولیس کی ساحل تک رہنمائی کی تھی اور پولیس سے اعتراف کیا تھا کہ اسی جگہ اس نے امروز کی لاش گھسیٹ کر پانی میں ڈالی

تھی اور اسے آہستہ آہستہ لہروں کے ساتھ گہرے پانیوں میں جاتے دیکھا تھا جیسے وہ کانٹے میں پروئے گئے چارے کو دور گہرے پانیوں میں ڈال کر مطمئن ہو جایا کرتی تھی اور ہلکی سی کھنکار پر اسے احساس ہو جاتا تھا کہ چارا پروئے کانٹے کو کسی مچھلی نے نگل لیا ہے اسے اس لیے بھی یقین تھا کہ امروز کی لاش کو مچھلیاں اپنی خوراک نہ بنالیں گی اور اس کی انگلیوں پر دباؤ محسوس ہوگا مگر لاش آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی تھی اور اسے کچھ محسوس نہ ہوا تھا اسے غوطہ خوروں کی ناکامی پر حیرت ہوئی تھی اور پولیس کے بار بار استفسار پر جھنجھلا جھنجھلا کر انھیں یقین دلانے کی کوشش کی تھی اور پاؤں زمین پر مار کر پورے اعتماد سے اس جگہ کی یقین دہانی کرائی تھی جہاں اس نے اپنی کارروائی کی تھی اور جہاں سے گھسیٹ کر وہ امروز کی لاش منہ زور لہروں تک لے گئی تھی اسے وہ جگہ، وہ رات وہ لمحے اور سرد لاش کا لمس اور غیر معمولی بوجھ اور لاش سے اٹھتی ہوئی ہلکی ہلکی بے نام ناگوار سی بو اور امروز کی بے بسی اور اپنی محنت کی تکان اور چڑھی ہوئی سانسوں کا بے ربط نظام اور لہروں کی بھیانک آوازیں اور لاش کا لہروں کے دوش پر ہچکولے کھانا اور دور ہوتے جھاگ کی تہہ میں چھپ جانا سب کچھ اسی طرح یاد تھا جیسے ابھی ابھی ایک لمحہ قبل ہی گزرنے والا منظر ہو غوطہ خوروں کی ناکامی پر اسے گمان ہوا بلکہ اس کا جی چاہا کہ کاش یہ سچ مچ ایک بھیانک خواب رہا ہو اور امروز زندہ ہو اور اس کی لاش سمندر میں نہ پھینکی گئی ہو۔

وہ پولیس کی کار میں چپ چاپ بیٹھ گئی، اس کا ستا ہوا چہرہ کاغذ کی طرح سفید تھا بال جگہ جگہ الجھ گئے تھے اور فادر روکاس نے پولیس کی گاڑیاں واپس جاتے دیکھیں اور مسلح پولیس والوں کو دیکھا اور گاڑیوں کے چلے جانے کے بعد اس لکیر کو دیکھا جو پولیس کی گاڑیوں سے نکلے ہوئے دھوئیں نے اس کے اور دور آبادی کے مکانوں کے درمیان کھینچ دی تھی۔ وہ اپنے تھکے ہوئے وجود کو اب اور زیادہ سمیٹ نہیں پا رہا تھا اس کی صاف ستھری گلی بندھی پاکیزہ زندگی میں اچانک آجانے والے قیامت کے یہ چند ہی گھنٹے بہت بڑی تبدیلیاں رونما کر چکے تھے۔ محض

ایک داستان سننے کے لئے اس نے دنیاداری کی روش اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور نہایت عجلت میں چرچ سے اپنا تعلق توڑ لیا تھا اور وہ داستان جسے وہ کنفیشن کہنے پر مصر تھی سنتے ہوئے ابتدا ہی سے اسے اپنے اندر کی تبدیلیوں کا عرفان ہونے لگا تھا وہ بظاہر اس کا کنفیشن سن رہا تھا لیکن باطن میں امیدوں اور خواہشوں کی نئی بستیاں بستی جا رہی تھیں اور وہ ان بستیوں میں اپنے کو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر ایک ان جانی مسرت کا اسیر ہوتا جا رہا تھا اور اسے تمام نیکیوں کے ضائع ہو جانے کا احساس تھا اور اس اسیری کا علم تھا لیکن وہ اس لذت سے پہلی بار آشنا ہوا تھا اسی لئے اس کے جذبات اس کے بس میں نہ تھے۔ اس پر سامنے بیٹھی ہوئی گوشت پوست کی زندہ عورت نے لذت کے وہ در وا کئے تھے جن کا اب تک اسے کسی نے سراغ نہ دیا تھا۔ اس کے نوجوانی کے تجربوں نے بتایا تھا کہ عورت ایک معمہ ہے، فریب ہے، خواب ہے۔ اس نے دینی کتابوں میں پڑھا تھا کہ عورت مرد کے سینے سے نکالی ہوئی ایک پسلی کی ضرورت ہے اور اسکا قرب دنیاداری کی ترغیب دیتا ہے لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ وہ خود عورت سے اس قدر آسانی سے اور ایسی عجلت میں متاثر ہو کر اپنا مرتبہ اپنی عبادت اپنی نیک نامی اور اپنی تعلیم سب کچھ داؤ پر لگا دے گا۔ وہ حیران تھا کہ اس نے کس طرح جان بوجھ کر اپنے سالہا سال کے جوگ کو بجوگ سے بدل کر رکھ دیا۔ وہ اتنے کمزور ارادے کا مالک نہ تھا ایسا ناتجربے کار بھی نہ تھا اس کا بچپن اور ماضی معلومات سے پر تھے وہ گناہ کو گناہ کی طرح پہچانتا تھا اس کے سامنے اب تک صدہا عورتیں کنفیشن کے لئے آ چکی تھیں خوبصورت، جوان اور ہوش و حواس پر چھا جانے والی آوارہ اور بدچلن عورتیں لیکن اسے کبھی اس طرحدار دعوت دینے والی اور بہت خوبصورت اور ذہانت سے گفتگو کرنے والی عورتوں نے اس طرح کبھی متاثر نہ کیا تھا کہ وہ سب کچھ بھول کر ایسا کانٹا حلق میں لگے جو اسے ڈوری کے اشارے پر اس طرف کھنچ جانے پر مجبور کر دے جدھر دوسرے سرے پر ڈوری پکڑنے والے ہاتھ اشارہ کریں۔ اسے عورتوں سے اس طرح

کی دلچسپی اب نہ رہ گئی تھی جو زیادہ دیر تک اس کے ہوش و حواس پر غالب رہ سکے مگر وہ جیسے گوشت پوست سے نہیں مقناطیس کی بنی ہوئی عورت تھی اور جیسے وہ جو کچھ ہونے والا ہو اس سے واقف ہو اور جو کچھ ہو چکا ہو اس سے بھی واقف ہو۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ گزشتہ چند گھنٹوں میں جو کچھ جس طرح ہوا تھا سب اس کی مرضی سے ہوا تھا وہ جس وقت پہلی بار عبادت کے بڑے ہال میں داخل ہوئی تھی اس وقت بھی جانتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کیا کرنے جا رہی ہے اور جس وقت وہ اپنے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں رات بھیگ جانے کے بعد لوٹی تھی اور انتھونی واکس بس کے جسم کی خوشبو میں پور پور اتر گیا تھا تو بھی جانتی تھی کہ اس ڈرائنگ روم سے ملحق بیڈ روم میں امروز کی لاش پڑی ہوئی ہے لیکن فادر انتھونی سے لمحہ لمحہ کے تعاون میں وہ بال برابر بھی پیچھے نہ تھی اور صرف چند گز کے فاصلے پر پڑی ہوئی ایک انسانی لاش اس کے اس جنسی تجربے میں نئے احساس اور انجانی لذت کا اضافہ کر رہی تھی حالانکہ لاش کی موجودگی کسی بھی رنگ کو پھیکا اور بے جان بنا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ فادر انتھونی واکس آرزوؤں اور پچھتاوؤں کے بوجھ تلے دیا ہی کار تک جانے کے بجائے سمندر کی طرف چلا گیا، سرکش لہریں آ آ کر لوٹ جاتی تھیں وہ نرم اور گیلی ریت پر گھٹنوں کے بل گر گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

انتظار حسین-(1925-2016)

انتظار حسین برطانوی ہندوستان میں ڈبائی، ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میرٹھ کالج سے بی اے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں آباد ہو گئے۔ یہاں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ صحافت کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ روزنامہ مشرق میں چھپنے والے ان کے کالم "لاہور نامہ" کو بہت شہرت ملی۔ وہ لاہور میں ایک بھرپور متحرک ادبی، صحافتی اور سماجی زندگی گزارنے کے بعد یہیں پر آسودہ خاک ہیں۔

انتظار حسین نے 1948 میں اپنی پہلی کہانی "قیوما کی دوکان" حلقہ ارباب ذوق، لاہور کے جس اجلاس میں پیش کی تھی مختار صدیقی صاحب نے اس کی صدارت کی تھی۔ اس کے بعد 1953 میں افسانوں کا پہلا مجموعہ "گلی کوچے" شائع ہوا۔ مجموعی طور پر ان کے افسانوں کے سات مجموعے شائع ہوئے۔ انہیں ان کی زندگی میں ہی ایک مستند اور رجحان ساز افسانہ نگار تسلیم کیا گیا۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے تین ناول اور دو ناولٹ بھی لکھے۔ انہیں حکومت فرانس نے "آفیسر آف دی آرڈر آف آرٹ اینڈ لٹریچر" عطا کیا۔ حکومت پاکستان کی جانب انہیں ستارہ امتیاز اور اکادمی ادبیات، پاکستان کی جانب سے "کمال فن ادبی ایوارڈ" سے بھی نوازا گیا۔ وہ پاکستان کے پہلے ادیب تھے جن کا نام بکر پرائز کے لیے شارٹ لسٹ ہوا تھا۔ زیر نظر انتخاب میں ان کے مشہور ناول بستی کے چند صفحات شامل کیے گئے ہیں۔

ان کا ناول "بستی" 1979 میں شائع ہوا۔ اس کا انتساب انہوں نے "عسکری صاحب کے نام" معنون کیا۔ ناول "بستی" میں مصنف نے وقت کو جس طرح زاویے بدل

پہلی کر دیکھا اور دکھایا ہے، وہ اس ناول کو منفرد بنانے کے لیے کافی ہے۔ ایک طرف تو ذاتی ماضی ہے اور دوسری جانب اجتماعی ماضی ہے اور پھر ذاتی حال ہے۔ ناول کے نصف آخر میں ذاتی حال اور اجتماعی ماضی آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ جس آشوب سے ناول کا مرکزی کردار اور اس کا گردوپیش دوچار ہے وہ نیا نہیں۔ یہ قیامتیں وہ ہیں جن کی جڑیں تاریخ میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جو الم ناکی دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ آشوب کو تکرار ہے یعنی ہر پھر کر اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ذاتی ماضی جو بچپن اور لڑکپن میں حاصل آزادی اور طرح طرح کی حیرت سے عبارت تھا کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ عمر جوں جوں گزرتی جاتی ہے بہت پرانا ذاتی ماضی روشن تر اور محبوب تر معلوم ہوتے لگتا ہے اور ذاتی حال بے معنی واردات کا ایک الجھاوا۔ انتظار صاحب نے ان کیفیتوں کو بڑی ہنر مندی سے بستی میں سمویا ہے۔

انتظار حسین کے ہاں ہجرت ایک بنیادی تجربہ ہے تخلیقی اعتبار سے ہجرت کے احساس نے انتظار حسین کے ہاں ایک یاس انگیز فضا کی تشکیل کی ہے۔ انتظار حسین کی دانست میں یادداشت انفرادی اور اجتماعی اور انفرادی تشخص کی بنیاد ہے۔ یادداشت نہ ہو تو ماضی بھی نہیں رہتا اور ماضی نہ ہو بنیاد اور جڑیں کچھ نہیں رہتا۔ گویا حال کی کیفیت ایک غبار سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ یاد کے معنی ہیں اپنے اجزائے ترکیبی کی شیرازہ بندی کرنا، سے تہذیبی انفرادیت کا وقار بخشنا۔ یادداشت انفرادی شخصیت کی بنیاد ہوتی ہے۔ ناول "بستی" میں ناول نگار کے شعور و احساس کے ذریعے ایک گم شدہ دنیا اچانک پھر سے اپنے خدوخال کے ساتھ نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور از سر نو بامعنی بن جاتی ہے۔

بستی

سال اشاعت:1979

انتظار حسین

مینہ اس کے اندر رات کے ٹوٹ کے برسا تھا۔ یادوں کی بدلیاں کہاں کہاں سے گھر کر آئی تھیں۔ آسمان اب دھلا دھلا اور نرم نرم تھا۔ کوئی کوئی بدلی ایک آسودگی کے ساتھ تیرتی رہ گئی تھی۔ کوئی اجلا سا چہرہ، کوئی نرم سی مسکراہٹ۔ وہ اس وقت اپنے آپ میں کتنا مگن تھا۔ باہر کی دنیا اس کے لئے اپنا مفہوم کھو چکی تھی۔ ناشتے کی میز پر بیٹھے بیٹھے اس نے اخبار کی سرخیوں پر بے تعلقانہ سی نظر ڈالی اور اسے ابا جان کی طرف سرکا دیا۔

ابا جان ناشتہ پہلے ہی کر چکے تھے اور اردو والا اخبار پڑھنے میں منہمک تھے۔ جب وہ میز پہ آکے بیٹھا تو انہوں نے اسے تعجب سے دیکھا "ذاکر! کیا آج تمہیں کالج نہیں جانا ہے؟"

"جانا تو ہے، آنکھ دیر سے کھلی۔"

"تو پھر جلدی ناشتہ کرو اور جاؤ۔" یہ کہتے کہتے پھر اخبار پڑھنے میں منہمک ہو گئے۔

اس کی آنکھ آج بے شک دیر سے کھلی تھی، پھر بھی اسے کوئی عجلت نہیں تھی۔ اطمینان سے نہایا دھویا، اب اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا۔

امی آئیں، چائے دانی کو ہاتھ لگا کر دیکھا "ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی۔"

"نہیں، ابھی ایسی ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے چلے گی۔" اس نے چائے دانی کو پانچوں انگلیوں اور ہتھیلی سے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! ناشتہ سویرے کر لیا کرو۔ آخر میں اکیلی دم ہوں۔ گھر کے سارے کام مجھے ہی نبیڑنے ہوتے ہیں۔" پھر فوراً ابا جان سے مخاطب ہوئیں: "اجی ڈھاکہ کے لئے کیا لکھا ہے؟"

"کوئی خاص خبر نہیں ہے۔"

ابا جان کی طرف سے منہ موڑ کر انہوں نے پاس پڑا ہوا انگریزی کا اخبار اس کی طرف سے سرکایا: "بیٹے! انگریزی کے اخبار میں دیکھ۔ اس میں کچھ لکھا ہو گا؟"

بے تعلقی سے پھر ایک نظر اخبار پہ ڈالی اور کہا: "کوئی قابلِ ذکر خبر ہی نہیں آتی۔"

"اس پہ بھروسہ رکھو۔" ابا جان نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں اسی پہ تو بھروسہ کیا تھا۔" امی جلے بھنے لہجے میں بولیں: "بھروسے ہی بھروسے میں یہ دن آ گیا۔"

ابا جان نے گھور کے امی کو دیکھا اور سرزنش کی: "ذاکر کی ماں بے دھیانی میں منہ سے نکلا ہوا کوئی ایک جملہ عمر بھر کی عبادت پہ پانی پھیرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔"

ندامت سے امی کا سر جھک گیا۔ چپ ہو گئیں پھر انہوں نے اور ہی بات شروع کر دی: "اجی تمہیں یاد ہے کہ میں نے اس وقت جتول سے کیا کہا تھا؟"

"کب کیا کہا تھا؟"

"جب ہم چلے تھے۔"

"ذاکر کی ماں! کب کی بات یاد کر رہی ہو؟ مجھے تو یاد نہیں ہے کہ تم نے اس وقت کس سے کیا کہا تھا؟"

"اجی تمہیں یاد نہ ہو، مجھے تو اس وقت کی ایک ایک بات یاد ہے۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے اسے خط لکھا تھا کہ تم ادھر آ جاؤ، اللہ مسبب الاسباب ہے۔ وہ تو ادھر آنے کے لئے تیار تھی مگر طاہرہ کے میاں پہ ایسی سنک سوار ہوئی کہ وہ اس طرح نکل گیا۔ اس غریب کو بھی بیٹی کی خاطر ادھر جانا پڑا۔"

"ذاکر کی ماں! جناب امیر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ سے پہچانا۔ تو ہمارے ارادے اس کی مرضی کے تابع ہیں۔ جو اسے منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔"

امی ایک دفعہ پھر چپ ہو گئیں اور سر جھک گیا، جیسے انھوں نے رضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا ہو۔

ابا جان اس کی طرف مخاطب ہوئے: "تمہیں شاید آج کالج نہیں جانا۔"

"بس جا رہا ہوں۔" اس نے ایک عجلت کے ساتھ چائے کے آخری گھونٹ لیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

گھر سے نکل کر گلی کا موڑ مڑتے مڑتے نظیرا کی دوکان پہ رکا۔ آتے جاتے اس دوکان پہ رکنا اور سگریٹ خریدنا اس کا معمول تھا۔

"ذاکر میاں! آج تو بہت گڑبڑ ہے۔" سگریٹ کا پیکٹ دیتے دیتے نظیرا نے ٹکڑا لگایا۔

"کل گڑبڑ نہیں تھی؟"

آج واقعی بہت گڑبڑ تھی۔ کالج پہنچا تو دیکھا کہ کھلے جا بجا ٹوٹے پڑے ہیں۔ کلاسیں خالی ہیں، شیشے دروازوں کے چکنا چور، کچھ کلاسوں کے اندر، کچھ باہر برآمدوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ لڑکے ندارد۔ کہاں گئے سب لڑکے۔ معلوم ہوا کہ سب کے سب نعرے لگاتے توڑ پھوڑ کرتے کالج سے نکل کر کہیں آگے جا چکے ہیں۔ اپنے کمرے میں گیا، بیٹھا، یاد کیا کہ آج اسے کیا لیکچر دینا تھا؟ مگر اب اسے کون سا لیکچر دینا تھا۔ بلاوجہ بلا سبب دراز کھول کر کچھ کاغذ اُلٹ پلٹ کئے میز پہ لگی کتابیں ادھر ادھر سے کھول کر دیکھیں، پھر بند کر کے رکھ دیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ گھر سے وہ یہاں سے شاداب چلا تھا اپنے آپ میں مگن، باہر سے بے تعلق۔ مگر یہاں تک پہنچتے پہنچتے باہر کی دنیا میں پھر سے مغموم پیدا ہوتا چلا گیا۔ اب اس کے

لئے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ اس فرصت اور تنہائی سے فائدہ اُٹھا کر آرام سے بیٹھے، سگریٹ سلگائے اور یادوں کی دنیا میں کھو جائے۔ کالج کا نقشہ درہم برہم دیکھ کر اسے خفقان سا ہو رہا تھا۔ پھر کیا کیا جائے؟ اچھا شیراز میں چلتے ہیں۔ ممکن ہے چوکڑی جمی ہو۔ عرفان کو تو ہر صورت اس وقت وہاں ہونا چاہئے۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔

تھوڑے وقت کے بعد وہ شیراز میں تھا اور عرفان سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا عرفان حیران تھا!

"آخر کون تھی وہ؟"

"بس تھی وہ۔"

"اس سے پہلے تو تم نے اس کا ذکر کبھی کیا نہیں تھا؟"

"میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔ ذکر کیا کرتا۔"

"بھول گیا تھا؟" عرفان نے اُسے تعجب سے دیکھا۔

"ہاں یار بھول ہی گیا تھا۔ دن بھی تو بہت ہو گئے۔"

"پھر اب کیسے یاد آ گئی؟"

"یہ ہماری یادوں کی واپسی کا موسم ہے۔ جانے کب کب کی بھولی باتیں یاد آتی ہیں۔"

"اس وقت جب کہ چاروں طرف اتنا ہنگامہ ہے؟"

"ہاں اس وقت جب کہ چاروں طرف اتنا ہنگامہ ہے۔" رکا، پھر بولا "معلوم ہے آج کل ہماری امی کا کیا مشغلہ ہے؟ روز صبح اخبار آنے پر سوال کرتی ہیں کہ ڈھاکہ کے لئے کیا لکھا ہے۔ تمہیں پتہ ہے نا کہ ہمارے کچھ عزیز ڈھاکہ میں آباد ہو گئے تھے؟ ہماری خالہ جان۔ تو امی پریشان رہتی ہیں اور روز صبح کو اخبار آنے پر سوال کرتی ہیں کہ ڈھاکہ کے لئے کیا لکھا ہے؟ اور جب انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو انہیں یاد آتا ہے کہ یہاں آنے پر انہوں نے خالہ

جان کو خط لکھا تھا اور مشورہ دیا تھا کہ اُدھر اللہ میاں کے پچھواڑے مت جانا ادھر آ جاؤ۔ اور
پھر انہیں ہجرت کے وقت کے بھولے بسرے قصے یاد آنے لگتے ہیں۔

"تو وہ ڈھاکہ میں ہے؟" عرفان نے قیافہ لڑایا۔

"نہیں۔ وہ تو پاکستان آئی ہی نہیں تھی۔"

"پاکستان نہیں آئی تھی؟ اچھا!" وہ سوچ میں پڑ گیا "اور تم تب سے ہندوستان نہیں گئے؟"

"نہیں"

"پھر تو واقعی بہت زمانہ گزر گیا۔"

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔" اس کی آواز دھیمی ہوتی چلی گئی۔ "بہت زمانہ گزر گیا۔"

"جلوس آ رہا ہے۔" ایک بدحواس ٹولی نے داخل ہوتے ہوئے خبر دی۔

"جلوس؟" مختلف میزوں پر بیٹھے ہوؤں کے کان کھڑے ہوئے۔

"ہاں، بہت بڑا جلوس ہے۔ توڑ پھوڑ کرتا چلا آ رہا ہے۔"

"اچھا؟"

شیراز میں بیٹھے ہوئے سب ہی لوگ گھبرا گئے تھے۔ کئی ایک اٹھے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔
عبدل تیر کے موافق کچن سے نکلا جلدی جلدی دروازہ بند کیا اور شیشوں پر پردے کھینچ دیئے۔

"آج کچھ زیادہ ہی گڑبڑ نظر آتی ہے۔" عرفان بڑبڑایا۔

"ویسے کل کی افواہ تو غلط نکلی۔"

"مگر کل تو وہ لوگوں کے لئے سچ تھی۔"

"ہاں کل تو وہ بالکل سچ نظر آ رہی تھی۔"

"خبر اور افواہ دونوں کی عمر ایک دن ہوتی ہے۔ دوسرے دن یہ جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ
وہ خبر نہیں، افواہ تھی یا وہ افواہ نہیں خبر تھی۔"

سلامت اور اجمل کچن کے راستے اندر داخل ہوئے۔ سلامت نے غضب ناک نظریں چاروں طرف ڈالیں اور انگشت شہادت چاروں طرف گھماتے ہوئے اونچی آواز میں کہا: "میں پوچھتا ہوں کہ دروازہ کیوں بند ہے اور پردے کیوں پڑے ہوئے ہیں اور اندھیرا کیوں ہے؟"

عرفان نے گھور کے سلامت کو دیکھا اور سرد مہری سے کہا: "اس لئے کہ باہر شور بہت ہے۔"

سلامت نے عرفان اور اسے دونوں کو غضب ناک نظروں سے دیکھا: "اور اس لئے کہ تم عوام کی آواز نہیں سننا چاہتے۔ مگر سامراجی دیو! یہ آواز اب نہیں دب سکتی۔ وہ پردوں کو چیر کر آئے گی اور تمہارے کانوں کے پردوں کو پھاڑ دے گی۔" پھر اس نے آواز دی: "عبدل!"

عبدل تیزی سے کچن سے نکل کر آیا۔ "ہاں جی!"

"عبدل! دروازہ کھول دو اور یہ پردے ہٹا دو۔"

"اور باہر سے روشنی اور ہوا آنے دو۔ روشنی ہوا اور عوام کی آواز۔"

اجمل نے تائیدی لہجے میں اضافہ کیا۔

"دروازہ مت کھولو۔ جلوس بہت بپھرا ہوا ہے۔" دور کی ایک میز سے آواز آئی۔

سلامت نے لال پیلے ہو کر کہا: "وہ عوام ہیں جو سرمایہ داروں اور سامراجی پٹھوؤں کے خلاف بپھرے ہوئے ہیں۔"

سلامت اور اجمل دونوں اسی میز پر بیٹھ گئے جس پر وہ اور عرفان بیٹھے تھے۔

سفید سر والا آدمی کہ دیر سے اکیلا بیٹھا چائے پی رہا تھا، اپنی جگہ سے اٹھ قریب آیا اور بولا: "آپ پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ کچھ بتائیے کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟"

سلامت نے اُسے حقارت سے دیکھا اور کہا: "وہ ہو رہا ہے جو ہونا چاہئے۔"

سفید سر والا آدمی سلامت کا منہ تکنے لگا۔ پھر ٹھنڈا سانس بھرا: "اللہ ہم پہ رحم کرے۔" اور واپس اپنی جگہ پہ جا بیٹھا۔

"یار میں یہ محسوس کرتا ہوں۔" سلامت بولا "یہ سفید سر والا آدمی میرے سفید سر والے باپ سے بھی زیادہ جاہل ہے۔"

"میرا باپ" اجمل بولا "تیرے سفید سر والے باپ اور اس سفید سر والے آدمی دونوں سے زیادہ جاہل ہے۔"

"مگر میرا باپ، میرا باپ نہیں ہے،" سلامت نے دانت کچکچائے "میں حرام زادہ ہوں۔"

اجمل نے اعلان کیا: "میں اپنے باپ کو اپنا باپ ماننے سے انکاری ہوں۔"

"یار ہمارے مکروہ باپوں نے ہمیں برباد کر ڈالا۔" سلامت کی آواز میں یکایک رقت پیدا ہو گئی۔

اجمل نے عرفان کو اور پھر اُسے دیکھا: "تم دونوں بھی تو کچھ بولو۔"

سلامت کو پھر غصہ آگیا: "یہ دونوں سمجھتے ہیں کہ وہ چپ رہ کر اپنے مکروہ باپوں کو اور ان مکروہ باپوں کے ناجائز بیٹوں کو وقت کی زد سے بچا لیں گے۔" میز پہ مکا مارا "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"سلامت صاحب آپ یہاں بیٹھے ہیں۔" ایک آشنا شخص کچن کی راہ سے داخل ہوتے ہوئے بولا: "وہاں گول مارکیٹ میں شراب کی دوکان لٹ رہی ہے۔"

اجمل نے چونک کر دیکھا "واقعی"؟

"ہاں جی، ہم ابھی ابھی ادھر سے ہی آ رہے ہیں۔ شراب نالیوں میں بہہ رہی ہے اور کتے بے ہوش پڑے ہیں۔"

"پھر چوک ہو گئی۔" اجمل متاسفانہ بڑبڑایا۔ پھر اس نے سلامت کو ٹھوکا: "یار چلیں۔ ذرا دیکھیں تو سہی۔"

"کہاں چلیں؟ کیا دیکھیں؟" سلامت نے بھنا کر کہا "کتوں کو بے ہوش دیکھنے کے لیے شراب کی لٹی ہوئی دوکان کے آس پاس جانا ضروری نہیں ہے۔ کون سی گلی ہے جہاں کتے بے ہوش پڑے دکھائی نہیں دیتے۔" پھر اس نے انگارے برساتی ہوئی نظروں سے ارد گرد کی میزوں کا جائزہ لیا اور چیخ کر بولا: "کتو! تمہیں اب ہوش میں آنا ہو گا۔ حساب کا وقت آ گیا ہے، حساب دینا ہو گا۔ تمہیں، مجھے، سب کو۔"

"سوائے میرے۔" افضال نے اطمینان سے کہا جو ابھی ابھی داخل ہوا تھا اور سلامت کو گرجتے دیکھ کر ٹیبل کے قریب آ کر خاموش کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ کرسی گھسیٹ کر سلامت کے سامنے بیٹھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا: "چوہے! تو دم پہ کیوں کھڑا ہے، حساب تو مجھے لینا ہے۔ اس مجھے بانسری کا انتظار ہے۔"

"بانسری کا اور شہر کے جلنے کا۔" سلامت نے غصے سے کہا۔

"شہر تو جل رہا ہے۔" افضال نے آنکھیں بند کیں، پھر کھولیں اور جیسے کسی دوسری دنیا سے بول رہا ہو۔ "چوہو! ڈرو اس دن سے جب بانسری کے ساتھ یہاں آؤں گا۔ میں آؤں گا اور تمہیں حکم دوں گا کہ بانسری کیا کہتی ہے میں تمہیں حکم دوں گا کہ چوہو میرے پیچھے چلو۔ تم بلوں سے نکلو گے اور میرے پیچھے چلو گے حتیٰ کہ میں سمندر پہ پہنچ جاؤں گا اور میں سمندر کو حکم دوں گا کہ سمندر ان چوہوں کو لے لے، اور سمندر تم سب چوہوں کو ایک سانس میں نیچے اتار لے گا۔"

"بکواس" سلامت چیخا۔

"سلامت مکروہ آدمی ہے۔" افضال بڑبڑایا "اور اجمل بھی، اور وہ بغل بچہ زوار بھی جو افسر بن کر مزید مکروہ ہو گیا۔ یہ پورا قبیلہ مکروہ لوگوں کا ہے۔" افضال رکا ذرا کر اور عرفان کو دیکھا جو چپ بیٹھے تھے۔ "یار تم دو اچھے آدمی ہو، خوبصورت آدمی۔ خوبصورتی دنیا میں کتنی کم ہو گئی ہے۔ ایک میں اور دو تم۔ صرف تین خوبصورت آدمی۔"

"یار یہاں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ آؤ گول مارکیٹ چلتے ہیں۔" اجمل نے سلامت کا بازو پکڑا اور نکل گیا۔

"ان تین میں سے میرا نام خارج کر دو۔" عرفان نے بیزاری کے لہجے میں کہا۔

"پچھتاؤ گے۔" افضال نے عرفان کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے پتہ ہے کہ اس فہرست میں ابھی بہت اضافہ ہونا ہے۔" عرفان نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔

افضال نے اسے گھور کے دیکھا۔ عبدل مختلف میزوں کا جائزہ لیتا ہوا یہاں پہنچا۔ افضال کو دیکھا اور مؤدبانہ بولا: "افضال صاب! آپ آ گئے؟ چائے لاؤں؟"

"نہیں"

"پانی؟"

"نہیں"

عبدل جانے لگا تو افضال نے اسے مخاطب کیا: "عبدل تو اچھا آدمی ہے۔" اور پھر اس نے جیب سے ڈائری نکالی، کھول کر کچھ لکھا، پھر کہا: آج کی تاریخ میں اچھے لوگوں کی فہرست سے میں نے عرفان کا نام کاٹ دیا اور تیرا نام لکھ لیا۔" پھر عرفان سے مخاطب ہوا: "آج سے تو بدصورت آدمی ہے۔ اور یاد رکھ کہ دنیا خوبصورت لوگوں سے کبھی خالی نہیں رہتی۔"

عبدل خاموشی سے سرک گیا۔ تھوڑی دیر میں ٹھنڈے پانی کے گلاس کے ساتھ واپس آیا: "سو جی افضال صاحب جی! پیو۔"

افضال نے تشکر آمیز نظروں سے عبدل کو دیکھا "عبدل! تو خوبصورت آدمی ہے۔" پانی پیا، پھر پوچھا: "وہ دونوں مکرو آدمی کہاں چلے گئے۔"

"گول مارکیٹ میں شراب کی دوکان ابھی ابھی کھلی ہے۔ وہ وہاں گئے ہیں اور تمہیں بھی وہیں جانا ہے۔" عرفان نے اپنے اسی زہر بھرے لہجے میں کہا۔

افضال نے عرفان کو خاموش غصیلی نظروں سے دیکھا، پھر اٹھا اور باہر نکل گیا۔

"یار! افضال تو آزاد بندہ ہے تم اس سے کیوں الجھتے ہو۔" ڈاکر بولا۔

"آزاد بندہ؟" عرفان بڑبڑایا "آزاد بندہ یہاں کون ہے؟"

"میرا مطلب ہے کہ لاابالی آدمی ہے۔ وہ کسی سیاست کا پرزہ نہیں ہے۔"

"یار بات یہ ہے کہ میں جس طرح جعلی انقلابیوں کو برداشت نہیں کر سکتا، بس اسی طرح جعلی پیغمبروں کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"پھر اصلی آدمی کون ہے؟"

"سب جعلی ہیں مع میرے۔" عرفان رکا، پھر بولا "پتا ہے کامریڈ سلامت کا بینک بیلنس کتنا ہے؟"

"بینک بیلنس سلامت کا؟ یار وہ تو چھانک آدمی ہے وہ کام کیا کرتا ہے جو کمائے گا اور بینک بیلنس بنائے گا؟"

"ڈاکر یہی تو تجھے پتہ نہیں۔ وہ بہت کچھ کرتا ہے۔" عرفان نے معنی خیز انداز میں کہا اور چپ ہو گیا۔

"یار اپنی سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں۔"

"سمجھ میں نہ آنے کی کیا بات ہے۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟" پھر لہجہ بدل کر بولا: "خیر یار چھوڑو اس ذکر کو۔"

"ہاں یار سمجھ گیا۔"

"ہاں تجھے کیا۔ تو تو آج کل کہیں اور ہے۔" عرفان جس کا چہرہ ابھی تک بہت تنا ہوا تھا، کسی قدر نرم پڑا اور مسکرایا۔ "یار ذرا کر! ادھر سے کوئی خط وط آتا ہے؟"

"خط؟ نہیں۔":

"میرا مطلب ہے کہ یہاں آ کر تم نے کبھی تو کوئی خط لکھا ہوگا۔ ادھر سے کبھی کوئی خط آیا ہوگا۔"

"نہیں" اس نے خفیف ہو کر کہا: "میں نے بھی کوئی خط نہیں لکھا۔ اس کی طرف سے بھی کوئی خط نہیں آیا۔"

"گویا اس وقت سے اب تک کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ کوئی پیام سلام نہیں؟"

"نہیں:"

"اور اب تو اسے یاد کر رہا ہے؟ یار تو کمال آدمی ہے"

واقعی کتنی عجیب بات ہے، اس نے سوچا۔ یہاں آنے کے بعد نہ میں نے اُسے خط لکھا اور اس نے کوئی خط بھیجا۔ یادوں کی گھٹن بدلی بھر امنڈنے لگی تھی۔ نیم تاریک رستے، پھر مکمل تاریکی، پھر کوئی منور منطقہ، ایک جگمگاتی یاد۔ صابرہ اب کتنی لمبی ہو گئی تھی اور سینہ اس کا کتنا ابھر آیا تھا کہ اب اسے وہ ہمیشہ دوپٹے سے ڈھانپے رکھتی تھی، پر وہ گول گول ابھار پھر بھی چھلکے چھلکے رہتے۔ باتیں ان میں آپس میں کبھی زور زور سے، کبھی ہولے ہولے کبھی اتنی ہولے کہ اس کی

آواز سرگوشی بن جاتی اور صابرہ کا منہ شرم سے لال بھبوکا ہو جاتا۔ واپس کالج پہنچ کر اس نے سریندر کے مشورے سے اس کے نام کتنا لمبا خط لکھا تھا۔

"ڈاک کر آئے خط ڈال دیا؟"

"یار ڈال تو دیا ہے مگر ۔۔۔۔" کہتے کہتے رک گیا۔

"مگر کیا؟"

"یار کہیں وہ سمجھ نہ جائے۔"

"خط اور کس نے لکھا ہے؟؟ اسی لئے تو لکھا ہے کہ وہ سمجھ جائے۔"

"یار اگر وہ سمجھ گئی تو ۔۔۔۔؟" کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"تو کیا ہو جائے گا؟"

"وہ سمجھے گی کہ ۔۔۔۔"

دروازہ پیٹنے کی آواز "کھولو" یاد کے منور منطقے سے اچانک واپس آتے ہوئے اس نے اس نیم تاریک فضا میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا اور میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ ایک پر اس کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"مت کھولنا جلوس قریب ہے۔"

"پتہ نہیں کون ہے؟"

"جلوس والے ہیں دروازہ مت کھولو۔"

"ارے بھائی! کھول دو ورنہ ان کا کیا ہے وہ آگ لگا دیں گے۔"

عبدل کچن سے نکل کر دروازے پر گیا۔ پہ وہ اک ذرا سا سرکا کر شیشے میں سے دیکھا، دیکھ کر مطمئن ہوا۔ دروازے کا ایک پٹ تھوڑا کھول کر آنے والوں کو عجلت سے اندر گھسایا اور فوراً دروازہ بند کر دیا۔

"یار! تم نے تو دروازہ ایسے پیٹا کہ ہمیں ڈرا دیا۔" ایک صورت آشنا نے شیراز میں آنے والی اس مستقل ٹولی کو دیکھ کر کہا۔

"اے بھائی! ڈرا ہوا کسی کو کیا ڈرائے گا۔"

"باہر کیا حال ہے؟"

"برا حال ہے۔ بہت توڑ پھوڑ ہوئی ہے۔"

یادوں سے بھرے دل و دماغ کے ساتھ اس نے کچھ سنا کچھ نہ سنا۔ وہ تو یادوں کے منطقے سے ایسے واپس آیا تھا جیسے سوتے سوتے کوئی دفعتاً جاگ اٹھے مگر نیند اسی طرح آنکھوں میں بھری ہو۔ نیند کی پری ایک جھونکے کی مثال آئے اور وہ پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے۔

یادوں کی پریاں اس کے ارد گرد منڈلا رہی تھیں۔ پھر صابرہ اس کے تصور میں چل پھر رہی تھی۔ جب وہ تھوڑے دنوں کے لئے ویاس پور آئی تھی۔ ان دنوں میں ہم دونوں آپس میں مکمل مل گئے تھے۔ انجن کی سیٹی کے ساتھ وہ بھی اسی کشادہ چھت پہ کھنچی چلی آتی جہاں میں اب بھی، جب میرٹھ سے چھٹیوں میں آتا تو شام سے رات تک بیٹھا رہتا اور دور تک پھیلے کھیتوں کو، کھیتوں سے رپے چمکتی ریل کی پٹری کو، ریل کی پٹری سے پرے درختوں کے پھیلے سلسلے کو دیکھتا رہتا۔ ہم دونوں منڈیر سے لگے سر سے سر جوڑے کھڑے رہتے۔ سیٹی دیتے، دھواں اگلتے انجن کو، انجن کے جلو میں حرکت کرتے منور ڈبوں کو دیکھتے رہتے۔ دن کو سینکں ڈبے الگ الگ دکھائی دیتے مگر رات کے اندھیرے میں تو بس ایسے لگتا کہ چراغوں کی قطار دوڑی چلی جا رہی ہے چراغوں کی قطار کھنچتی چلی جاتی دوڑتی چلی جاتی جب گزر جاتی تو صابرہ خوشی اور حیرت سے کہتی: کتنی لمبی ریل تھی، ڈبے ہی ڈبے کون سی گاڑی تھی یہ؟"

"دلی جانے والی۔"

حیران رہ جاتی۔ "یہ گاڑی دلی گئی ہے!"

"ہاں اور کیا"

تھوڑا چپ رہ کر: "ڈاکٹر! تم نے تو دلی دیکھی ہو گی؟ کیسی ہے دلی؟"

"بس ایک دفعہ گیا ہوں مگر امتحان دے لوں، پھر وہیں جا کے رہوں گا۔"

"اچھا!۔۔۔۔ کیسے؟" وہ حیران رہ گئی۔

"وہیں جا کے نوکری کروں گا۔"

"اچھا"

رات ہو چلی تھی۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔ ہاں چند ایک ستارے آسمان کے پھیلاؤ میں دور دور چراغوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ میں نے صابرہ کے حیرت بھرے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"صابرہ!"

"ہوں۔"

انور سجاد-(1937-2019)

انور سجاد چونا منڈی، لاہور شہر میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل سید محمد سجاد انور علی بخاری تھا۔ ان کے والد دلاور علی پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے، لہذا ان کی خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے انور سجاد نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کیا۔اس کے بعد ڈی ٹی ایم اینڈ ایچ کا امتحان لندن سے پاس کیا۔ وطن واپس آکر انہوں نے طب کا پیشہ اختیار کر لیا۔وہ امراض اطفال کے ماہر تھے۔

وہ ایک ہمہ جہت فنکار بھی تھے۔ فکشن کے علاوہ ان کی دلچسپی کا دائرہ مصوری، رقص، ڈراما نگاری، اداکاری اور سیاست تک پھیلا ہوا تھا۔وہ جدید اردو افسانے کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ان کا پہلا افسانہ 1952 میں شائع ہوا۔ان کا پہلا ناولٹ "رگ سنگ" 1955 میں شائع ہوا۔اس کے بعد 1965 میں افسانوں کا پہلا مجموعہ "چوراہا" چھپا۔ مجموعی طور پر ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔اس کے علاوہ ان کے دو ناولٹ اور تین ناول بھی شائع ہوئے۔

وہ جدیدیت کی تحریک کے سرخیل مانے جاتے تھے۔انہوں نے اپنے افسانوں کے علاوہ اپنے ناولوں میں مختلف تجربات کیے۔"خوشیوں کا باغ" اردو کا پہلا اینٹی ناول ہے، جو کئی لحاظ سے اردو کا ایک اہم ناول سمجھا جاتا ہے۔اس انتخاب میں اسی ناول سے ایک حصہ شامل کیا گیا ہے۔

"خوشیوں کا باغ" بظاہر پندرھویں صدی کے ایک یورپی مصور بوش کی تین پینلز پر مشتمل ایک مشہور تصویر "ارضی خوشیوں کا باغ" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔اس پینٹنگ کے تین حصوں کے نام بالترتیب یہ ہیں: ہوا کی تخلیق، خوشیوں کا باغ اور موسیقی کا جہنم۔

یہ ناول کافکا کے دی ٹرائل کی طرح زمان و مکان کے تعین سے گریز کرتا ہے۔ یہ اپنی تجریدی سطح کو مستحکم کرنے کے لیے مختلف طریقے اپناتا ہے۔ اس پورے ناول میں کہیں کسی سیاست دان کی تقریر ہے، کہیں وعظ ہے، کہیں کسی مداری کا تماشا ہے، کہیں کسی کردار کی سوچ ہے۔ ان تمام ٹکڑوں کو مصنف نے منطقی ربط دینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ ناول زبان کی سطح پر فکشن اور شاعری کی حدیں توڑ کر دکھا دیتا ہے۔ ڈاکٹر انور سجاد کے سیاسی اعتقاد اور ان کے وجودی سروکار کو جس میں وابستگی کے عنصر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، یہ ناول بہت خوبی سے منعکس کرتا ہے۔

"خوشیوں کا باغ" میں بہت سی حکایتیں ہیں جن کے ذریعے سیاسی رہنماؤں اور لیڈروں پر لطیف طنز کیا گیا ہے۔ کہیں پر رومانی طرز عمل ہے مگر معاشرتی بے حسی کا لبادہ اوڑھے کرآتا ہے۔ کم عمری نوجوان لڑکی کے ابھرتے اور جوان ہوتے احساسات کیا چاہتے ہیں اور زندگی کو کس طرح سے گزارنا چاہتے ہیں ان سوالوں کا جواب انور سجاد نے دینے کی کوشش کی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے جس طرح ہر چیز پر اپنا قبضہ جما لیا ہے اور مشینوں کی کھڑکھڑاہٹ نے جس طرح دل و دماغ بند کیے ہیں۔ روبوٹ قسم کے انسان بنا دیے ہیں چیف ایکاؤنٹنٹ اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام اس قدر خوبصورت طریقے سے حملہ کرتا ہے کہ آغاز میں اس کی دی گئی مراعات کے سامنے دنیا کی ہر طاقت ہیچ نظر آتی ہے۔ مگر جب تک اس کی حقیقت کے اثرات کھلتے ہیں تب تک دماغ اتنا شل ہو چکا ہوتا ہے کہ پھر کچھ اور کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

انور سجاد کا نقطہ نظر ہے کہ عالمی اقتصادی طاقتیں بظاہر تو دوسری اقوام کو قوت دیتی ہیں لیکن سیاسی آزادی کے دوران ہی بالادر قومیں ان کا استحصال کر کے ان کو معاشی بحران میں

دھکیل دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ان اقوام کی حالت نہیں بدلی ہے اور ان کا مقدر قحط، بھوک اور خسارہ ہے۔

خوشیوں کا باغ

سال اشاعت:1981

انور سجاد

ٹریفک کو کسی بھی معاشرے کے مزاج کا آئینہ سمجھا جا سکتا ہے۔

چاند کتنا خوبصورت ہے۔

ہماری کھڑکیاں، بے وفائیوں سے روشن!

تم بے وفا ہو؟ کیسے ہو؟

تم بے وفا ہو۔ کمینی ہو۔

میں چودہ برس کی ہوں۔

میں چودہ برس کی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے ہمیشہ زندہ رہوں کہ مجھے محبت ہے گرمیوں کی راتوں سے جو پرسکون جھینگروں کے گیتوں اور چاند کے گرد ہالے سے سجی ہوتی ہیں۔ مجھے اس سنگیت سے محبت ہے جو زمین سے بلند ہو کر تاروں بھری رات پر چھا جاتا ہے مجھے اپنی امی کے پیارے چہرے، ابو کی پر شفقت آواز، بھائی کی بڑی بڑی آنکھوں اور بہن کی ہنسی سے محبت ہے۔ زندگی کے ساتھ محبت ہو گئی ہے مجھے دوستی بہت اچھی لگتی ہے۔ جب آنکھ مچولی کھیلتی ہوں تو آنکھوں پر بندھی پٹی سے دوسروں کے ساتھ قربت کا شدید احساس ہوتا ہے بلکہ چھپ جانا کتنی دلدادہ راحت دیتی آئی ہے۔ مجھے پتا ہے چودہ سال کی ہر لڑکی راجہ جی کی بھی ہوتی ہے۔

میں صابرہ ہوں۔ میرا حلقہ بہت محدود ہے، میرا کنبہ اور چند سہیلیاں اور شاید وہ پڑوسی لڑکا جو میرے کمرے کی کھڑکی پر کنکر مارتا ہے اور مجھے زہر لگتا ہے کہ اس حرکت کے

باعث مجھے کمرے کی اکلوتی کھڑکی بند رکھنا پڑتی ہے ورنہ اب تک میرا کمرہ کنکریوں سے بھر گیا ہوتا۔ مجھے مستقبل میں کچھ نہیں چاہئے، اپنے گھر، محبت اور تحفظ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

میں چودہ برس کی ہوں اور بے قرار ہوں۔ راتوں میں جب مجھے نیند نہیں آتی تو میں سمندر کی لہروں کا شور سنتی ہوں جو مجھے دور دراز کی پُر اسرار دنیاؤں کی سیر کی ترغیب دیتی ہیں۔ تب میں اپنے امی ابو، بھائی بہن، گھر کے کاج، اسکول کے کام اور دوسری مصیبتوں کا حصار توڑ دینا چاہتی ہوں اور اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر اپنے ستارے تک پہنچ جانا چاہتی ہوں جو میرے مستقبل کا ستارہ ہے جو چھوٹی سی کمین دھند کے ٹکڑے میں غائب ہے۔ میں پھر بھی جانا چاہتی ہوں میں اداس ہوں مجھے سسکیاں لیتے رفتہ رفتہ مرتے سال کے غم کا پتہ ہے جس کی نشانی وہ درخت سے ٹوٹ کر ناتوانی سے لرزتے زمین پر گرتے پتے کرتے ہیں اس ٹوٹی ہوئی محبت کو پہچانتی ہوں جو آنکھوں میں جھلکتی ہے اور میں قدرت کی اس ناانصافی پر روتی ہوں کہ پیدا ہونے کا تو صرف ایک طریقہ ہے اور مرنے کے سو طریقے۔

میں چودہ برس کی ہوں اور تنہا۔ دھند میں لپٹی سرد دوپہر اس میں تنہا پرندے کا خوف زدہ گیت میری زبان پر ہے میں اس احساس کو جانتی ہوں جب بھری پری دنیا میں یوں لگتا ہے جیسے کوئی تنہا ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر کھڑا ہو۔

میں چودہ برس کی ہوں اور مجھے نفرت ہے۔ نفرت کرنے والوں سے متعصب ہوں۔ متعصب لوگوں کے لئے، مجھے نفرت ہے ان بونوں سے جو قد آوروں کو اپنی کمینگیوں، ذلالتوں اور سازشوں سے باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے نفرت ہے ان جابر آسمانوں سے جو ہمارے گرد سمٹ کر صاف و شفاف خوبصورت کائنات سے اذیت، کرب اور اداسی کو نچوڑتے ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے میں ابھی مر جاؤں۔

باہر تالا کھلنے کی آواز آتی ہے۔ پتہ چلتا ہے، صبح ہو گئی ہے گنتی پوری ہے۔ سب اچھا
ہے۔ آٹھ ساتھی بوئی پیچھے پر۔ دور ورکشاپوں کی طرف سے چند آدمیوں کی ایک ٹکڑی اس
طرف آتی ہے جو قریب آ کر ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سب سے
آگے جیل سپرنٹنڈنٹ ہے ہاتھ میں بید لئے، سیاہ چشمہ لگائے چھتری کے نیچے، چھتری پکڑنے
والا مصاحبین لیفٹی ڈپٹیوں، نمبرداروں کے ساتھ ایک قدم پیچھے چلچلاتی دھوپ میں ہے۔ جیل
سپرنٹنڈنٹ خوبرو آدمی ہے لیکن اس کے دائیں گال کو ایک چوتھائی ڈھانپے جلد کی کسی بیماری
کا نشان ہے جو دوائیوں کے مسلسل استعمال سے دب جاتا ہے اور کبھی کبھی بری طرح رسنے لگتا
ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ یہ نشان اس وقت رہتا ہے جب اس کی انتہائی درشت طبیعت،
نرم روی کا رن مناتی ہے۔ شاید اسی لئے وہ ذرا سی بات پر ماں بہن کی گالیاں دیتا بیڑیاں پہنا دیتا
ہے، چکی میں بند کر دیتا ہے کہ اس کے چہرے کا نظم مندمل رہے۔ اس کی طبیعت اس بیماری
کی وجہ سے ظالمانہ ہے یا ظالمانہ طبیعت کی وجہ سے اسے یہ بیماری ہے ابھی تک یہ پتا نہیں چل
سکا۔ سنا ہے کہ اس کی عمل داری میں دوسری جیلوں کی طرح جوا، منشیات کا کاروبار اور منڈے
خانے کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے، اسی لئے جیل کے کھانے اور ہسپتال کے اعلیٰ ترین
معیار کے باوجود سب اسے گالیاں دیتے ہیں۔ ہمیشہ سنتے ہیں کہ اس کی تبدیلی ہونے والی ہے
اس لئے نہیں کہ اس کا سلوک قیدیوں کے ساتھ بہت جابرانہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ خود کھاتا
ہے نہ کھانے دیتا ہے اور نہ کسی کو کھلاتا ہے۔ اسی لئے سب افسر، خاص طور پر افسران بالا اس
سے نالاں ہیں کہ قیدیوں اور ان کے لواحقین سے رشوت تو در کنار وہ جیل فنڈ میں بھی خورد
برد نہیں کرتا، جس سے ان کو اس جیل سے خاصا خسارہ ہوتا ہے۔ اس کے خلاف جعلی رپورٹوں

کے باوجود اسے کوئی بد نہیں سکا۔ معلوم ہوتا ہے اس کا جیک بہت ہی تگڑا ہے۔ جب وہ مسکرانا
چاہتا ہے تو ہاتھ میں پکڑے بید کو زور زور سے اپنی ٹانگ پر بجاتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں
پکڑے رومال سے چہرہ خشک کرنے کے بہانے ہونٹوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔ وہ ابھی چند قدم
کے فاصلے پر ہے کہ بوٹی پنچے والے الرٹ ہو جاتے ہیں۔ با ادب با ملاحظہ ہوشیار، نگاہیں رو برو۔
جو جہاں وہیں ساکت، وردار اٹین شن ہو کر سیلوٹ مارتا ہے۔ وہ وہاں رکتا نہیں جس سے پتا چلتا
ہے کہ سب اچھا ہے۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملاحظہ گزر گیا ہے۔ آٹھ
ساتھیوں میں پھر حرکت ہوتی اور وہ پسینہ پونچھ کر رمبی سے گھاس کاٹنے میں پھر مصروف
ہو جاتے ہیں۔ شاید ہے کہ خود کو نیشنلسٹ کہلوا کر بہت خوش ہوتا ہے اور تھوڑا معصوم بھی
ہو جاتا ہے۔ اسے جیل میں باغیچوں کو ٹیپ ٹاپ سے رکھنے کا جنون ہے۔ پھولوں سے بہت پیار
کرتا ہے، اسی لئے اکثر لوگ بوٹی پنچے پر رہتے ہیں اور جب جیل میں بہار آتی ہے تو اس کے
باوجود کہ اس موسم میں اس کے چہرے کا زخم بری طرح رسنے لگتا ہے۔ اس کا منہ چوم لینے کو
جی چاہتا ہے۔

پھر چاند طلوع ہوتا ہے
وہ اپنے ہاتھوں کی سخت انگلیوں کے روزنوں سے جھانکتا ہے۔
پھر اسے کسی کی چیخ سنائی دیتی ہے
چیخ، چیخ، لمبی چیخ۔
وہاں کوئی نہیں کھڑکی سے ذرا ہٹ کر بس درخت ہے جو اس پر چیختا ہے۔
وہ دیکھتا ہے ایک جسم ڈولتا، تڑپتا اٹھتا ہے، درخت کا سہارا لیتا، اس کے ساتھ گھسٹتا،

عورت برہنہ، ورانیں، خون میں لتھڑی، یہ کون ہے؟

وہ اندھیرے میں گھورتا ہے۔ اس عورت کی چیختی آنکھوں کو دیکھتا ہے خوف کے مارے اس کی چیخ نکل جاتی ہے وہ فوراً ہاتھ بڑھا کر بستر کے ساتھ والی میز پر پڑا لیمپ روشن کرتا ہے۔

میری بیوی بڑے سکون سے میرے ساتھ لیٹی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر بچگانہ مسکراہٹ ہے جیسے کوئی سہانا خواب دیکھتی ہے۔ میری بیوی بھی ایک حسین خواب ہے۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔

الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم کے اسپیکروں سے اٹھتا شور، موسیقی کا جہنم۔

اذیت میں کھلے دہنوں سے آہ و بکا چیخ و پکار اس ساؤنڈ سسٹم سے موجزن طربیہ نغموں سے ابھر نہیں پاتی۔ لاوے کا سمندر جو زمین کو دائیں طرف کاٹ کر خلیج بن گیا ہے اس پر بنے پل پر سے ان گنت لوگوں میں سے بہت سوں نے لاوے کے سمندر میں چھلانگیں لگا دی ہیں۔ کچھ ڈوبے اور کچھ جلتے بجھتے تیرتے کنارے کی جانب بڑھتے ہیں۔ بہت سے کنارے پر پہنچ چکے ہیں اور خودوں میں چہرے چھپائے زرہ بکتر والوں کے نرغے میں آ چکے ہیں، جو انہیں کچھ کے دیتے ریوڑ میں ڈھال لیتے ہیں۔ دور سے یہ سب کچھ پتلیوں کی طرح نظر آتا ہے۔ خلقت کو نیزوں سے کچوکے دینے والے خودوں میں چہرے چھپائے زرہ بکتروں والے بھی اور خلقت بھی۔

یادداشتوں میں لہو کی مقدار کتنی ہے ان گنت جوہڑ لبالب بھرے جن کی سطح پر کنول کے پھولوں کے بجائے کٹے ہوئے سر ہلکورے لیتے ہیں۔ دور نزدیک ساحل پر کوئی جل پری نہیں جو لیٹ کر آدم زاد کا انتظار کرے۔ ساحل کی تپتی ریت پر نمکی کے دانے پھول بن جاتے ہیں یادوں کے گرد لہو کا ہالہ بغاوتیں لاچار لیکن آنکھوں میں جوان دھڑکتی، نئی آزادی کی تصویر۔

اگرچہ اکاؤنٹنٹ، چیف اکاؤنٹنٹ سے توقع نہیں کی جا سکتی لیکن میں اپنے پیشہ ورانہ لٹریچر کے علاوہ اور بھی بہت کچھ پڑھتا ہوں۔ میرے دوستوں میں شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ میں جب ان میں بیٹھ کر گفتگو کرتا ہوں تو گمان ہوتا ہے کہ میں بھی ان دانشوروں کی قبیل سے ہوں۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں شعر بھی کہتا ہوں۔ چوری چھپے راتوں میں اٹھ اٹھ کر بیوی بھی پوچھ لیتی ہے تو فرم کے اکاؤنٹس کا بہانہ کر کے اپنی لائبریری میں آ جاتا ہوں میں اسے کسی الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کا ایک کوئی بھید تو ہونا چاہئے کہ جسے وہ صرف اپنے تک محدود رکھے۔ ایسی کسک جسے بنانے والا کوئی نہ ہو، جسے وہ چپکے سے کاغذ پر اتار دے۔ جب طبیعت کو چین آ جائے تو اس کاغذ کو میز کی سب سے نچلی دراز میں رکھ کر تالا لگا دے۔

لائبریری سے واپسی پر پہلے میں اپنی بچیوں کے کمرے میں جا کر انہیں سوتے ہوئے پیار سے دیکھتا ہوں پھر اپنی خوابگاہ میں جا کر اپنی نیم خوابیدہ بیوی کے ہونٹوں کا بوسہ لیتا ہوں۔ اس کے ساتھ لیٹ جاتا ہوں۔

پھر چاند طلوع ہوتا ہے۔

تمہیں معلوم نہیں اکائی کی دریافت کی طرح صفر کی دریافت بھی انتہائی خوفناک اور انتہائی خطرناک ہے۔

(میری سمجھ میں نہیں آتا اکائی اور صفر کی دریافت اہم تو ہے مگر انتہائی خوفناک خطرناک کیسے ہے)

میں جانتی ہوں عملی ثبوت کے لئے واردات سے گزرنا ضروری ہوتا ہے وہ منکر ہوتی ہے۔

(میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اس جملے کا پہلے جملے کے ساتھ کیا ربط ہے)

ابھی تھوڑی دیر پہلے چوکیدار ہمیں کوٹھی دے کر گیٹ پر بنے کیبن میں جا چکا ہے۔

بائیں باغ میں کھلتی کھڑکی سے آتی ہلکی سی کپکپی طاری کر دینے والی بھیگی بھیگی ہوا۔ اکتوبر کی آخری راتوں میں ایک رات۔ مجھے اس کا رنگ بہت پسند ہے، بے حد سانولا گرم بھڑکتی دھوپ میں جوان ہوتی کپاس کی پھلی۔ جانے میرے ذہن میں اس کا یہ تصور کیوں ابھرتا ہے حالانکہ اس کا بدن میرے ناپ تول کے نظام کے عین مطابق ہے گدرایا کپاس کی پھلی کی طرح سوکھا سڑا نہیں۔ اپنے کھردرا کھردار جو سانس کے لمس کو بھی روک روک دے۔ سنگ مرمر کی طرح پھسلا دینے والا نہیں وہ خوشبو نہیں لگاتی۔ اسے پرفیوم سے الرجی ہے۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ اس کی خواہش کے خلاف میں کچھ بتاتا ہوں۔ اسے پیالی تھماتے ہوئے بھرپور سانس لے کر اسے بتاتا ہوں کہ اسے کسی خوشبو کی ضرورت نہیں۔

وہ شرما جاتی ہے۔

چاروں اور سے بادل گھر آتے ہیں بجلی کڑک، طوفان اور بارش جانے اس پر کیا جادو ہوتا ہے کہ وہ احمق ہے اور بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنستی ہوئی پائیں باغ میں کھلتی کھڑکی سے باہر باغیچے میں پھلانگ جاتی ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے جاتا ہوں بارش اور بھی تیز ہو جاتی ہے وہ مجھے طوفان میں طوفان، بجلیوں میں بجلی بارش میں بارش دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بازو پھیلے ہیں چہرہ آسمان کی جانب اٹھا ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں بند ہیں۔ میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا دیکھتا ہوں اس کا لباس اس کے بدن کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ گیلا دوپٹہ اس کے کاندھوں سے پھسل کر گھاس پہ رینگ جاتا ہے طوفان، بجلی، بارش ہوا اس کے ایک ایک مسام میں اتر چکی ہے اب وہ زمین کی مٹی سے اٹھا کر مجسمہ ہے میں طوفان، بجلی، بارش، ہوا کے ساتھ اس کے ایک ایک مسام میں سرایت کر جانا چاہتا ہوں۔ روح بن کر اس مجسمے میں داخل ہو جانا چاہتا ہوں۔

جب ہماری آنکھیں رفتہ رفتہ کھلتی ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم باغیچے میں کم از کم دو انچ پانی میں ڈوبے ہیں۔ وہ میرے ساتھ چمٹی دور سے اڑ کر آتی چڑیا کی طرح لرزتی ہے میرا جسم بھی لرز جاتا ہے۔

وہ سرگوشی میں کہتی ہے اب مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے چاروں بچے زنا بالجبر کی پیداوار ہیں۔ مجھے اپنے شوہر کے ساتھ کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا۔

اب میری سمجھ میں آ جاتا ہے کہ عملی شمولیت کے لئے واردات سے گزرنا کتنا ضروری ہے، اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اگر ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا تو میرا کیا حشر ہوگا۔

نہیں۔ یہ گھر میرا نہیں ہے میری فرم کا گیسٹ ہاؤس ہے۔ اگر میری فرم کے مالکوں کو پتا چل جائے کہ میں اور یہ اس وقت یہاں پائیں باغ میں یوں دو انچ پانی میں ڈوبے ہیں تو غالباً انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ گیسٹ ہاؤس کا مصرف ہی کچھ ایسا ہے۔

تب فقیہ اور شہر کے لوگ ایک عورت کو لاتے ہیں جو زنا میں پکڑی گئی ہے عورت کو بیچ چوراہے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی۔ توریت میں موسیٰؑ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں۔

پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے۔

وہ استاد کو آزمانے کے لئے، اس پر الزام لگانے کے سبب ڈھونڈنے کے لئے موسیٰ کا حوالہ دیتے ہیں۔

استاد جھک کر انگشت شہادت سے زمین پر کچھ لکھنے لگتا ہے۔

وہ استاد سے سوال کرتے ہی رہتے ہیں۔

استاد سیدھا ہو کر ان سے کہتا ہے: تم میں سے وہ کہ جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو وہی پہلا پتھر مارے۔

استاد پھر جھک کر انگلی سے زمین پر کچھ لکھنے لگ جاتا ہے۔

یہ سنتے ہی ہر راہگیر ہاتھوں میں پتھر لئے چل پڑتا ہے۔

جب ہجوم چھٹتا ہے تو چوراہے میں ہزار ہا پتھروں میں دو لاشیں گرم خون میں ڈوبی سرد نظر آتی ہیں۔ زانیہ کی اور استاد کی۔

بکھرے بکھرے بالوں اور الجھی الجھی داڑھی والا دہن سے ٹپکتی رال، آنکھوں میں وحشت، چہرے پر ملال لئے ایک شخص چیتھڑے سے ستر ڈھانپے جانے کہاں سے آتا ہے اور تھانے چلا جاتا ہے۔ وہاں سے اسے دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہے۔ پولیس والے زانیہ اور استاد کے کیس کی ایف آئی آر درج نہیں کرتے کہ مجذوب کی شہادت باعتبار نہیں ہوتی۔

میں صبح سویرے فرم کے کام سے لاٹ صاحب کے دفتر جاتا ہوں۔ دفتر کی چار دیواری کے کونے سے لے کر فٹ پاتھ تک لوگ ہی لوگ ہیں۔ ٹریفک جام ہے میرا ڈرائیور کار کو آگے نہیں لے جا سکتا۔ میری زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے۔ کم بخت پولیس کہاں ہے کھلم کھلا مارشل لا کی خلاف ورزی ہے یہ جلوس۔ میں ڈرائیور کا جواب سنے بغیر: فائلیں اٹھا کے کار سے اتر کر پیدل ہی دفتر کو چل دیتا ہوں۔ لاٹ صاحب کے ساتھ میری ملاقات کا وقت مقرر ہے مگر میں دیر سے پہنچا تو صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ گپ لگانے کے لئے میٹنگ میں چلا جائے گا۔

کوفی اور بسکٹوں پر میرے اور لاٹ صاحب کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جانے مجھے اس کی شکل خرگوش سے کیوں ملتی جلتی لگتی ہے۔ میں ایک آدھ بار آنکھیں

بھی مل کے دیکھتا ہوں۔ کیا یہ اس کی لرزتی مونچھوں اور کھڑے کانوں کے باعث تو نہیں؟ پتہ نہیں بہر حال مجھے کیا۔ لاٹ صاحب ایک اطمینان سے پائپ پیتا اپنی آنکھوں کو میری آنکھوں میں ڈال کر نہ جھپکے۔ جنگ تو مجھے ہی جیتنا ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ میں اس سرد جنگ میں اپنی مٹھی کی گرمی کو لاٹ صاحب کی سرد مٹھی میں کیسے اتارتا ہوں کہ اس کی مٹھی بھی گرم ہو جائے۔

مشن کی تکمیل کے بعد ہم دونوں پلکیں جھپکائے بغیر، اپنے اپنے ہونٹوں پر اپنی اپنی فاتحانہ مسکراہٹ لئے مصافحہ کرتے ہیں۔

میں لاٹ صاحب کے دفتر سے باہر نکل آتا ہوں تین گھنٹے بعد ہی چوالیس درجہ سنٹی گریڈ میں لوگ اسی طرح کھڑے ہیں بلکہ ہجوم میں اضافہ ہو گیا ہے کوئی نعرہ نہیں، کوئی ٹیر گیس کی بو نہیں ٹریفک کے دو سپاہی ایک طرف کھڑے بے دلی سے سگریٹ پیتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ہجوم بس تالیاں بجاتا ہے۔ سب کے سب گردنیں اٹھائے لاٹ صاحب کے دفتر کے کونے کے اندر احاطے میں لگے اس بورڈ کے پیچھے کہ جس پر سول سیکریٹریٹ لکھا ہے آگے آم کے پرانے پیڑ کو دیکھتے ہیں۔ مسکراتے ہیں، ہنستے ہیں، ہیجان میں بحث کرتے ہیں پھر اس پر تجسس ہے حیرت ہے۔ مجھے اپنے دفتر جلدی پہنچنا ہے کہ اپنے مینیجنگ ڈائریکٹر کو جلد از جلد اپنی فتح کی خبر سنا سکوں۔ کم بخت ڈرائیور نے کار کہاں پارک کی ہے؟ میں بمشکل لوگوں کو چیرتا فٹ پاتھ تک پہنچتا ہوں جہاں میری کار کھڑی ہے میرا ڈرائیور بھی منہ کھولے اسی سمت دیکھتا ہے۔ میری آواز سن کر وہ قریباً ہیجان میں آم کے پیڑ کی جانب یوں اشارہ کرتا ہے جیسے عید کا چاند دکھا رہا ہے۔ سر جی وہ سانپ، طوطے، اب مجھے طوطوں کی ٹائیں ٹائیں سنائی دیتی ہے۔ لاٹ صاحب کے دفتر کے احاطے میں لگے پرانے آم کے پیڑ کے اوپر کے حصے میں جہاں تنا شاخوں میں پھیلتا ہے، اس سے نکلتی سب سے بڑی شاخ کے گرد ایک بہت بڑا سانپ لپٹا

ہے جو بے شمار طوطوں کی دائیں بائیں کرتی چونچوں سے ادھ موا ان میں سے کسی ایک کو اپنے منہ میں لینے کی کوشش کرتا ہے کہ اپنا زہر اس میں اتار سکے۔ سانپ سے ذرا ہٹ کر چھوٹی سی کھوہ میں ایک گھونسلا ہے جس میں ایک کوئل سہمی بیٹھی ہے۔ سرگی۔ ڈرائیور اپنی تھیوری بیان کرتا ہے۔ سانپ کوئل کے گھونسلے میں منہ ڈالنا چاہتا تھا، انڈے رہے ہوں گے بچاری نے کہ گردن ہلاتے ہی اس کی پھنکار قریب بیٹھے طوطے پر جا پڑی۔ طوطے نے چیخ چیخ کر ساری قوم کو اکٹھا کر لیا اور بالآخر سانپ نڈھال ہو جاتا ہے بری طرح زخمی تنے پر اس کی گرفت چھوٹ جاتی ہے اور وہ لاٹ صاحب کے دفتری میں گر جاتا ہے ہجوم بے تحاشا تالیاں بجاتا ہے۔ میرے شہر کے زندہ دلان کا بھی جواب نہیں۔

راستہ بھر چپ رہتا ہوں۔ سانپ آنکھیں نہیں میچتے۔

انسان کا سب سے بڑا جرم حقیقت کا ادراک کرنا کرانا ہے بس ننگی حقیقت کا ادراک کہ جس سے وہ ننگے ہو جائیں جو کھینچے ہوئے ملبوسات میں اپنی برہنگی کو چھپاتے ہیں۔

ساحل کے کونے، تیس درجے کے معکوس زاویے پر ابھی تک کشتی کا اگلا حصہ ساحل کے سینے پر ہے اور پچھلا حصہ سمندر کے پیٹ پر۔

دھیرے دھیرے بجتی ہوا کشتی کے ساتھ ہولے ہولے ٹکراتی لہروں کی دھنک اور کشتی کے وسط میں عمودی مستول کے ساتھ افقی بندھے بانس کے گرد لپٹے سرخ بادبان کی صلیب،

عمود اور افق کی تصلیب،

ایک طرف زمین پر دانہ تلاش کرنے والے اور دوسری طرف وہ جو سیارے کے وسائل پر قادر ہیں۔

کشتی اپنا بطن وا کیے ان سب کی منتظر ہے جن کے ہر ہر مسام میں آنکھ ہے۔ کان اور زبان بھی جو بہت عجیب لوگ ہیں اور اتنے ہی غریب بھی اور جو اس سے راستوں کی رکاوٹوں کو ہٹا کر صحیح و سالم اس کشتی تک پہنچنے کے وسیلوں کی تلاش میں ہیں کہ راستوں پر بھوت پریتوں کے ڈیرے ہیں۔

جہاں ان کا سنہرا مقصد ان کے جسموں سے کھینچ کر سونے کے ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔

گولڈن فلیس،

جس کے گرد کرنسی نوٹوں کے ڈھیر ہیں جنھیں بس ایک چنگاری دکھانے کی دیر ہے۔ تو جلدی کرو جلدی کرو اس سے پیشتر کہ

تم اتنے کم عمر ہو؟ وہ حیرت سے پوچھتا ہے۔

جواب دینے والی آواز میں تھوڑی سی اداسی تھوڑا سا فخر ہے۔۔جی سر۔۔

چند لمحے خاموشی، پھر وہ پوچھتا ہے تم بھی کسی لڑکی سے محبت کرتے ہو؟

جی سر۔۔۔

دونوں پھر چپ ہو جاتے ہیں۔

پھر وہ چیخ کر کہتا ہے۔ پھر تم موت کے منہ میں کیوں جانا چاہتے ہو تمھیں پتا نہیں کہ جنگ میں۔۔

تاکہ واپس آسکوں سر اپنی محبوبہ کے پاس۔۔

وہ کاٹن دینے کے بجائے نرمی سے کہتا ہے: جاؤ۔۔۔

سر۔

وہ سیلوٹ کر کے چلا جاتا ہے۔

وہ اداس ہو جاتا ہے۔ اپنے اردلی سے کہہ کر اسے چند منٹ آرام چاہیے اپنی کرسی میں خود کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں وہ لڑکی گھوم جاتی ہے جس کے ساتھ وہ بچپن میں شٹاپو کھیلا کرتا تھا۔

گھر جانے کی خواہش اس کے سینے میں تڑپتی ہے صرف چند لمحوں کے لئے اپنی محبوبہ کے پاس صرف اتنے لیے کہ وہ اس سے کہہ سکے، میں ابھی آیا۔

مندرجہ ذیل حقیقتوں کا پتا چلتا ہے۔

ایک۔ اس کا شوہر وہاں ایک ٹی ایسٹیٹ یعنی چائے کے باغات کا منیجر یعنی اس ایسٹیٹ کا حکمران تھا۔ اس کا برٹش راج اسٹائل محض اپنی راجدھانی پر ہی نہیں چلتا تھا بلکہ وہ اپنے گھر کو بھی اپنی کالونی سمجھتا تھا۔

دو۔ اس کی شادی اس کے شوہر کی ضد کے باعث ہوئی تھی۔ وہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کے اپنے جذبات بالکل سادہ تھے کہ اگر شادی ہونا ہی ہے تو پھر اس کے ساتھ کر لینے میں کیا حرج ہے اسے لگاؤ یا عشق کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

تین۔ اس کالونی میں اس کے ہاں چار بچے پیدا ہوئے۔

چار۔ وہ بہت پڑھی لکھی ہے اسے شروع ہی سے مطالعے کا بہت شوق تھا۔ مطالعے اور تجربے کے حوالے سے اپنی ملکی صورت حال کو سمجھنا اس کا دردِ سر تھا اور جو کچھ اس کی سمجھ میں آتا تھا اس پر وہ کانپ جاتی تھی۔

پانچ: اس کا آخری بچہ سی سیکشن یعنی سیزیرین آپریشن سے ہوا تھا۔ وہ اس کی اذیت اور پیچیدگیوں سے واقف تھی اور جب وہ اپنے اس تجربے کو قوموں کے جنم پر منطبق کرتی تھی تو رو دیتی تھی۔

چھ: اس کا شوہر اسے انتہائی احمق اور غبی سمجھتا تھا اور شراب کے نشے میں اسے پیٹتا تھا۔

سات: وہ اس کے ساتھ مجامعت کے دوران ہمیشہ ضد کرتا کہ وہ اپنی کیفیت بیان کرے جس سے اسے اتنی ہی کراہت محسوس ہوتی تھی جیسے اسے ماہواری کے دوران ہم بستری سے۔ اگر وہ اس کی جنسی سرکس کا قصیدہ پڑھنے سے انکار کر دیتی تو وہ اس کی خوب پٹائی کرتا۔ کئی کئی دن تک اس کے ساتھ بات نہ کرتا۔ وہ اس کی موجودگی میں دوسری عورتوں کو بھی بیڈ روم میں استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

آٹھ: وہ بہت تنہا تھی لیکن اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں خود کو بہت محفوظ محسوس کرتی تھی۔

نو: اس نے اس سرزمین میں جڑیں بھی پکڑ لی تھیں۔ وہ ان کی زبان سیکھ گئی تھی۔ ان میں رچ بس سی گئی تھی۔ اسے ان کے لوگ گیت آتے تھے اور ان کی گالیاں بھی۔ اس کا شوہر صاب تھا لیکن وہ میم صاب نہ بن سکی تھی۔

دس: وہاں کی واحد سوشل مصروفیت شام میں کلب جانا تھی باقی کی دوسری ٹی اسٹیٹس کی طرح۔ کچی پگڈنڈی مار کر سڑکیں جن پر جیپ میں سوار معدہ اچھل اچھل آتا تھا اور پھر تاریک پُراسرار دل دہلا دینے والے جنگل ہی جنگل کلب میں تمام ٹی صاب، ان کی میم صابوں اور بابا لوگ آتے تھے۔ یک رنگ شامیں، یکسانیت کے مارے اسکینڈل، رفتہ رفتہ وہ شامیں بھی گھر پر گزارنے لگی تھی۔ شوہر کے بغیر بچوں، ملازموں، ٹی مزدوروں کے ساتھ ان کے کھیلوں، ناچ گانوں میں شریک، شوہر کی شدید ناراضی کا اظہار، دوسروں کی بیویوں کے ساتھ کلب میں فلرٹیشن سے ہوتا تھا جن کے سامنے وہ اپنی بیوی کی بدخوئیاں کر کے ان کی ہمدردیاں حاصل کرتا تھا۔

گیارہ: مزدوروں کی ہڑتال پر تو وہ بالکل ارڈ نکا ئیو کی حراسی اوا لا رہن گیا شام میں چند مزدور اس کے شدید زخمی، نیم بے ہوش شوہر کو کندھوں پر اٹھا کے گھر لائے۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ اسے اس لئے زندہ چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنی بہن کا سہاگ نہیں اجاڑنا چاہتے تھے، بچوں کو یتیم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

بارہ: باغیوں (انقلابیوں؟) نے وہاں کے لوگوں کے ساتھ اس کی محبت کے باوجود اس کے شوہر کی تلاش میں کونہ کونہ چھان مارا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ دراصل اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ گیا ہے تو انہوں نے عہد کیا کہ اگر وہ کہیں مل گیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ بالکل مبہوت ہو کر رہ گئی تھی جب انھوں نے کرفیو کے باوجود اسے بچوں سمیت بحفاظت اس جگہ پہنچا دیا جہاں سے وہ جہاز پکڑ سکتی تھی۔

تیرہ: وہ انھیں حق پر جانتی تھی کہ اس کا صاب وہاں کی کل سیاسی صورت حال کی تجسیم تھا کہ یہ کئی برسوں کی بے اعتنائی غیر ذمہ داری، پر تعیش راحت، بے اعتباری، سطحی شعبوں، مذہب کے کھوکھلے نعروں اور غیر مساوی سلوک کا منطقی نتیجہ تھا۔

چودہ: یہاں آ کر وہ کئی سال تڑپتی رہی اپنے اس حصے کو ترستی رہی جسے وہ وہاں چھوڑ آئی تھی۔

پندرہ: یہاں اس کے شوہر کا رویہ پاگل پن کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہر وقت گھر میں خوف وہراس سے سہمے ہوئے وہ ہر لحظہ بے چینی کی حالت میں رہتی کہ اس کا شوہر اس کی پٹائی کے علاوہ اور کیا کر گزرے۔ اس نے داڑھی بڑھالی تھی۔ مزاروں پر حاضریاں، وظیفے چلہ کشی اور تعویز گنڈوں عملیات کے دور سے گزر کے اپنی ولایت کا اعلان کرنے والا تھا۔ کاروبار تباہ ہو گیا تھا اور اب ان اٹھاؤں پر گزارہ ہو رہا تھا جو وہ وہاں سے سمیٹ کر لا یا تھا۔

سولہ: اس کی پرتیں کھولتے کھولتے وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس کا شوہر بیمار ہے۔

انور سن رائے-(1950-)

انور سن رائے خیر پور ٹامے والی میں پیدا ہوئے۔ 1963 میں کراچی آگئے اور اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی صحافت کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ اردو کے بڑے اخباروں کے ساتھ وابستہ رہنے کے علاوہ وہ چار روزناموں کے بانی اور مدیر رہے۔ اس کے بعد بی بی سی سے وابستہ ہو کر برطانیہ چلے گئے جہاں کئی برس گزارنے کے اب وہ کراچی میں مستقل طور پر مقیم ہیں۔

وہ بنیادی طور پر صحافی، شاعر، فکشن نگار اور مترجم ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''چیخ'' 1987 شائع ہوا۔ اس کا پانچواں ایڈیشن ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ انور سن رائے کے لیے ہوئے عربی کے مشہور شعرا ادونس اور محمود درویش کی شاعری کے تراجم کیے جو شائع بھی ہوئے۔ ان کا دوسرا ناول ''ذلتوں کے اسیر'' 1997 میں شائع ہوا۔

انور سن رائے کا ناول ''چیخ'' ان کی ادبی شناخت کا ایک اہم حوالہ ہے۔ انور سن رائے نے اپنے ناول ''چیخ'' میں اذیت خانے میں ہونے والے تشدد کو بیان کیا ہے، کہ کس طرح ایک بے گناہ انسان پر ایک ایسے جرم کو قبول کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جاتا ہے جو کہ اس سے سرزد بھی نہیں ہوا۔ اس ناول میں ایک فرضی شخص کی کہانی بتائی گئی ہے، جس کا نام غلام ولد غلاموں ہے۔ اس کے والد برطانوی فوج میں تھے۔ غلام خیر پور ٹامے سے کراچی آتا ہے اور اپنی اصل شناخت کو چھپا دیتا ہے تاکہ اسے کوئی بھی پہچان نہ سکے۔ وہ اپنا نام بدل کر ایک اخبار میں کام کرتا ہے مگر ایک دن اس کے گھر میں کچھ لوگ گھس کر اسے لے کر جاتے ہیں جس کے بعد اسے عقوبت خانے میں ایک تکلیف دہ تشدد سے گزرنا پڑتا ہے۔ جہاں اس کی چیخ و پکار بھی اس کے سوا کوئی اور سن

نہیں سکتا ہے، کیونکہ سب مردہ ضمیر اور سخت دل انسان ہوتے ہیں وہ صرف اذیتیں دینا جانتے ہیں۔ وہاں صرف دو لوگ چیخ کو سن سکتے ہے ایک وہ خود اور دوسرے وہ جو اس کی طرح تشدد کے ان مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں، مگر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ جسمانی اور ذہنی تشدد کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ان کی چیخ خود کو بھی سنائی نہیں دیتی۔ وہ صرف جسم کے اندر رہ جاتی ہے۔ اذیت خانے میں انسان تشدد میں صرف ایک چیز چاہتا ہے اور وہ ہے موت۔ وہ اس تشدد سے تھک کر موت کو اپنانا چاہتا ہے۔

اس ناول میں انور سن رائے نے اذیت خانے میں گزرنے والے درد، تکلیف اور مرحلوں کو بیان کیا ہے کہ جب ہم سچائی اور حق کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اذیت خانوں میں ان تکلیفوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

پیچ

سالِ اشاعت: 1987

انور سن رائے

گاڑی چلی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا اپنی منزل کے بارے میں، اس شخص کے بارے میں جس نے خود کو مرکزی حکومت کا ڈپٹی سیکریٹری بتایا تھا اور مجھے بڑی فراخدلانہ پیشکش کی تھی اور جو اس پیش کش کے بارے میں میرا جواب لینے کے لئے آنے والا تھا، لیکن اس اچانک سفر نے ایک بار پھر، شروع سے اب تک کی ہر بات کو مشکوک بنا دیا تھا۔ یوں بھی اب تک جو کچھ ہوا تھا، اس میں کوئی منطق تو تھی نہیں بس کچھ بے جوڑ ٹکڑے تھے جنہیں جوڑ کر بھی کوئی واضح یا غیر واضح نتیجہ نکالنا ممکن نہیں تھا۔ ہر بات اچانک شروع ہو کر اچانک ختم ہو رہی تھی اور میں ایجنسی کے اس شکنجے کا ایک انتہائی ادنا شکار تھا جس کا بنیادی اصول شکار کو ہر بات سے بے خبر رکھنا تھا، چاہے وہ اس سے متعلق ہو یا نہ ہو۔

ہماری مسافت طویل تھی، کیوں کہ راستے میں ہماری سواری کئی جگہ رکی، لیکن جب مجھے اتارا گیا تو گاڑی ایک کشادہ سبزہ زار کے تقریباً وسط میں اس طرح کھڑی تھی کہ اس کے سامنے بیرونی دروازہ اور پیچھے سرخ کھپریلوں والا برآمدہ تھا جو اپنے دن کی وجہ سے بڑا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس برآمدے میں کئی دروازے تھے، لیکن ایک دروازے کے سوا جس پر بھاری پردہ پڑا ہوا تھا اور جس کے سامنے سنگین لگی بندوق سے مسلح سنتری کھڑا تھا، سارے دروازے بند تھے۔ مجھے اسی کمرے میں لے جایا گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی انگریزی کے حرف "ایل" جیسی ایک میز اپنی چمکدار سطح کے باعث سب سے پہلے توجہ کا مرکز بنی تھی اور پھر دیوار کے ساتھ ساتھ رکھے ہوئے

لکڑی کے بینچ، پرانی ساخت کا ٹائپ رائٹر، خاکی رنگ کی فائلیں اور غیر شہری چہروں والے دو کلرک۔ مجھے کمرے کے ایک کونے میں بٹھانے کے بعد، مجھے لانے والوں میں سے ایک بڑی دھیمی آواز میں، ان میں سے ایک کلرک سے گفتگو کر رہا تھا گفتگو کے بعد اس نے خاکی رنگ کی ایک فائل کلرک کے حوالے کی جسے لے کر وہ اندر کھلنے والے دروازے میں داخل ہو گیا۔

"تم لوگوں نے دیر کر دی ہے لیکن خیر "کچھ دیر کلرک کے ساتھ آنے والے لیفٹیننٹ نے ناگواری سے میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے لانے والوں سے کہا

"سر۔۔۔!!"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟" لیفٹیننٹ نے اُن میں سے ایک کو جو غالباً تاخیر کا عذر پیش کرنا چاہتا تھا کوئی موقع دیئے بغیر مجھ سے پوچھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنا نام بتاتا، اسی شخص نے جس نے صفائی پیش کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اُسے میرے نام سے آگاہ کر دیا۔

"ملازم۔۔اچھا۔۔۔اس کی ہتھکڑیاں کھول دو۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر لگے گی۔۔۔اچھا۔" یہ کہتا ہوا واپس اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔

میرے ہاتھ کھول دیئے گئے اور اس کے تھوڑی دیر بعد مجھے لانے والے کلرک سے اجازت لے کر چلے گئے، خیر وہ تو چلے گئے لیکن ان کے جاتے ہی سنتری اندر آن کھڑا ہوا۔

"کہاں کے ہو؟" تھوڑی دیر بعد کلرک نے پوچھا۔

"کراچی کا"۔ میں نے جواب دیا۔

"اچھا"۔ اس نے ناگواری سے کہا اور اپنے دائیں ہاتھ رکھی ہوئی فائلوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

لکڑی کے بینچ، پرانی ساخت کا ٹائپ رائٹر، خاکی رنگ کی فائلیں اور غیر شہری چہروں والے دو کلرک۔ مجھے کمرے کے ایک کونے میں بٹھانے کے بعد، مجھے لانے والوں میں سے ایک بڑی دھیمی آواز میں، ان میں سے ایک کلرک سے گفتگو کر رہا تھا۔ گفتگو کے بعد اس نے خاکی رنگ کی ایک فائل کلرک کے حوالے کی جسے لے کر وہ اندر کھلنے والے دروازے میں داخل ہو گیا۔

"تم لوگوں نے دیر کر دی ہے لیکن خیر" کچھ دیر کلرک کے ساتھ آنے والے لیفٹیننٹ نے ناگواری سے میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے لانے والوں سے کہا

"سر۔۔۔!!"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟" لیفٹیننٹ نے ان میں سے ایک کو جو غالباً تاخیر کا عذر پیش کرنا چاہتا تھا کوئی موقع دیئے بغیر مجھ سے پوچھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنا نام بتاتا، اسی شخص نے جس نے صفائی پیش کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اُسے میرے نام سے آگاہ کر دیا۔

"ملازم۔۔۔اچھا۔۔۔اس کی ہتھکڑیاں کھول دو۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر لگے گی۔۔۔اچھا۔" یہ کہتا ہوا واپس اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔

میرے ہاتھ کھول دیئے گئے اور اس کے تھوڑی دیر بعد مجھے لانے والے کلرک سے اجازت لے کر چاے، خیر و چیز چلے گئے لیکن ان کے جاتے ہی سنتری اندر آن کھڑا ہوا۔

"کہاں کے ہو؟" تھوڑی دیر بعد کلرک نے پوچھا۔

"کراچی کا"۔ میں نے جواب دیا۔

"اچھا"۔ اس نے ناگواری سے کہا اور اپنے دائیں ہاتھ رکھی ہوئی فائلوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کمرے میں لگی ہوئی گھنٹی بجی وہ ایک بار پھر اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس طرح کوئی تین بار وہ گھنٹی بجتی رہی اور وہ اندرونی حصے میں جاتا اور آتا رہا۔ اس کے بعد میرا بلاوا بھی آ گیا۔

مجھے اندر لے جانے کی ذمے داری سنتری کے سر ڈالی گئی۔ اندرونی دروازہ ایک نیم تاریک، سرد اور بمشکل چھ فٹ چوڑی راہداری میں کھلتا تھا۔ ہر چند کہ میں سنتری کے آگے بہت دیر تک چلتا رہا، لیکن اس دوران مجھے ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ چند قدم اور چلنے کے بعد یہ راہداری بند ہو جائے گی، دیواریں سمٹنا شروع کر دیں گی اور چھت بیٹھ جائے گی۔ مجھے اپنے ننگے پاؤں تلے، دبیز قالین، قدموں کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف سرکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے بھی قالین کی سرد اور نرم سطح پاؤں اٹھانا دشوار کر رہی تھی اور اس کے باوجود کہ ایک سنگین بردار نگران کے ساتھ چلتے ہوئے اس قسم کی خواہشیں زیادہ دیر تک دل میں نہیں ٹھہرتیں میں پاؤں گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔

راہداری کے آخر پر ایک منقش دروازہ تھا اور اس دروازے کے آگے راہداری جیسا ایک نیم تاریک اور سرد کمرہ اور اس کمرے میں ایک اور سنگین بردار سنتری۔ پہلے سنتری نے مجھے اس سنتری کے حوالے کیا اور واپس پلٹ گیا۔

"دوسرے سنتری نے آگے والا دروازہ کھولا اور مجھے پہلے سے زیادہ سرد اور تاریک کمرے میں دھکیل دیا۔ بہت جلد میری آنکھیں نئی تاریکی سے بھی مانوس ہو گئیں۔ اسے کمرہ کہنا زیادتی ہو گی وہ تو اچھا خاصا دربار تھا کشادہ اور آراستہ صرف اس کٹہرے کی موجودگی غیر ضروری تھی جو عدالتی کٹہروں سے مختلف، صاف ستھرا، چمکدار میرے پیٹ تک بلند اور داخلی دروازے کے بعد مجھے اپنے حصار میں لے کھڑا تھا۔ کسی جادو گھر کی طرح دربار مجھ پر آہستہ آہستہ منکشف ہو رہا تھا۔ کٹہرے کے علاوہ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک، پورے فرش پر،

گہرا سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ کٹہرے کے بالکل سامنے میرے قد کے برابر اونچا سٹیج دائیں
سے بائیں دیوار تک پھیلا ہوا تھا اور اس پر آتی ہی لمبی ایک میز رکھی تھی، جس پر قالین کے
رنگ کا سرخ میز پوش بچھا ہوا تھا۔ میز کے پیچھے ایک دوسرے سے معمولی فاصلے پر رکھی کرسیوں
کی منقش ٹیک دکھائی دے رہی تھی۔ میز کے دائیں اختتام پر ایک اور میز اور ایک عام سی کرسی
کے ساتھ ذرا سے فاصلے پر ایک روسٹرم دکھائی دے رہا تھا۔

روسٹرم پر سامنے کی طرف وسط میں بنے ایک دائرے میں سیاہ اور سنہرا رنگ چمک رہا تھا۔
جس نے آہستہ آہستہ طویل فاصلے کے باوجود بڑی میز پر کندہ اور نمایاں دکھائی دیتے ہوئے،
سنہری سینگوں والے سیاہ بکرے کے سر کی شکل اختیار کر لی۔

کمرے کی چھت بہت اونچی تھی، چھت کیا تھی ستاروں بھرے آسمان کا ایک ٹکڑا
تھا اور کمرے میں جتنی روشنی تھی، ان ہی ستاروں سے پھوٹ رہی تھی۔ مجھے کمرے میں
دھکیلے جانے کے بعد دروازہ بند کر لیا گیا تھا اور اب میں وہاں اکیلا تھا اور اس جادو گھر کو اچھی
طرح دیکھنے کے سوا میرے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ یقیناً معمولی سے رد و بدل کے بعد
اس کمرے کو جسے میری اور کٹہرے کی موجودگی ایک شاہی عدالت بنا رہی تھی کسی رئیس یا
وسیع الاختیار حکمران کے عشرت کدے میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔

مجھے اس سے پہلے کسی عدالت میں حاضر ہونے کا تجربہ نہیں تھا۔ لیکن اس سے کیا
فرق پڑتا ہے۔ جب ذات ہی تہ ہو تو ذاتی نوعیت کے تجربات کی کیا اہمیت۔ لیکن اس کے باوجود
میں بہت ساری عدالتوں سے واقف رہا ہوں، قدیم قبائلی عدالتیں سرداری اور جاگیرداری
عدالتیں اور انگریزی فلموں میں دکھائی جانے اور انصاف تک رسائی کو دھوکہ دینے والی ہر
ساخت اور ہر زمانے کی عدالتوں تک رسائی ممکن ہو گئی ہے لیکن اس عدالت جیسی کوئی عدالت

میں نے اب تک نہیں دیکھی، غالباً یہ سرسری سماعت کی خصوصی عدالت ہے، یہ عدالت انصاف تک رسائی میں دوسری عدالتوں سے مختلف ہوگی یقیناً۔

میں سوچ رہا تھا اور اسے کا کوئی بھی آدمی کمرے کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں بڑی آسانی سے بتا دے گا کہ: سٹیج پوری طرح تیار ہے صرف پردہ اٹھنے کی دیر ہے۔ ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ چھوٹی میز کے پیچھے لگے ہوئے پردے میں حرکت ہوئی اور ایک طویل قامت شخص، میری موجودگی سے بے نیاز، آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز تک آیا اور میز پر رکھی ہوئی فائلوں کو دیکھنے لگا، پھر فائلیں اٹھائیں اور بڑی میز کی طرف آگیا۔ شاید چھوٹی میز اور بڑی میز کے درمیان آنے جانے کے لئے کوئی راستہ بھی تھا، جو کٹہرے میں کھڑے ہوئے شخص کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بڑی میز کے بعد اس نے ایک فائل روسٹرم پر بھی رکھی اور پھر چھوٹی میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی خاموشی عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی شاید یہ اس کی عدم توجہ تھی جسے میں اپنے خون کے ساتھ پورے جسم میں دوڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

اب وہ روسٹرم کے سامنے اس طرح کھڑا تھا کہ اگر میں اسے تھوڑی دیر پہلے، خود اپنی آنکھوں سے چلتے اور حرکت کرتے ہوئے نہ دیکھ چکا ہوتا تو اسے روسٹرم کے سامنے رکھا ہوا مجسمہ ہی تصور کرتا۔ روسٹرم کے سامنے اس طرح کھڑے ہوئے بھی اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بڑی میز کے عقبی پردے میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور تین نصف دائرے ایک ساتھ کرسیوں کے درمیانی فاصلے میں نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تین مختلف چہروں میں تبدیل ہو گئے۔ دائیں جانب کے چہرے پر لگے ہوئے سر کا درمیانی حصہ بالکل صاف اور چمکدار تھا اور درمیانی سر پر کنپٹیوں تک کٹے ہوئے بال بڑی ترتیب سے جمے ہوئے تھے اور آخری سر گھنگریالے بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے دو چہرے صحت مند گردنوں پر اور دائیں جانب کا سر قدرے کمزور گردن پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کے باوجود تینوں چہرے یکساں خوشحالی کا

منظر تھے۔ ان میں سے دو نے خاکی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ جن پر لگے ہوئے نشان درمیانے شخص کو کرنل اور بائیں جانب والے کو میجر ظاہر کر رہے تھے جب کہ دائیں جانب والا شخص سفید قمیض پر سنہری پٹی والا سبز گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ تینوں نے کرسیوں پر بیٹھتے ہی عینکیں نکالیں، صاف کیں اور ناک پر اس طرح ٹکا لیں کہ اگر وہ چاہتے تو مجھے ان عینکوں کے اوپر سے بھی بہ آسانی دیکھ سکتے تھے لیکن اس وقت تو ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے سامنے رکھی ہوئی فائلوں کا مطالعہ کر رہے ہوں، مجھ پر انہوں نے ایک سرسری نگاہ ڈالنا بھی ضروری نہ سمجھا لیکن تھوڑی دیر بعد کرنل کے اشارے پر روسٹرم کے سامنے کھڑے ہوئے مجسمے میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے بولنا شروع کیا۔

ملزم غلام ولد غلام محمد۔۔۔" روسٹرم کے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے صاف سنی جا سکنے والی سرگوشی کے انداز میں میرا نام لیا اس کے بعد غالباً اس نے میرا پتا دہرایا ہو گا۔ لیکن میں اس سے آگے اس کی آواز نہیں سن سکا۔ اب تک جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے بعد کسی آواز کا بہت زور سے سنائی دینا یا سنائی ہی نہ دینا دونوں باتیں یکساں طور پر ممکن تھیں۔ ضروری نہیں تھا کہ میں اس کا الزام صرف اس پر رکھتا، جس نے ابھی مجھے اس نام سے پکارا تھا جس نے میری زندگی کو اوپر سے نیچے کی طرف پلٹ دیا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی پوری توجہ اس کے ہونٹوں کی طرف مبذول کر دی۔ ممکن ہے وہ ان لوگوں میں سے ہو جو جملے کا آغاز تو بڑی قوت سے کرتے ہیں لیکن جملے کے آخر تک آتے آتے ان کی آواز محض حرکت کرتے ہونٹوں کا اشارہ بن کر رہ جاتی ہے۔ میں ایسے کئی لوگوں سے مل چکا ہوں۔ دوسری بہت سی باتوں کی طرح بولنے کا انداز بھی طرز زندگی کا اظہار ہوتا ہے اب اس شخص ہی کو لے لیں، غالباً وہ اس عدالت میں پیش کار کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ جس طرح اس نے میرے نام اور ولدیت سے جملے کا آغاز کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر کام کو بڑی توانائی سے شروع کرتا ہے

لیکن اسے تکمیل تک پہنچانے اسے اتنی دشواریاں پیش آتی ہیں کہ کام مکمل ہوتے ہوئے بھی نامکمل ہی رہتا ہے۔

اس وقت ضرور اسے کوئی ایسی دستاویز پڑھنے کا فرض سونپا گیا ہے جس کا مجھ سے اور میری زندگی سے گہرا تعلق ہے لیکن اس شخص کا طرز زندگی میرے آڑے آگیا ہے اور اپنے نام سے آگے ایک لفظ سننا بھی میرے لئے ممکن نہیں رہا۔ کیا وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے؟ یقیناً نہیں، وہ مکمل طور پر ایک لاتعلق آدمی دکھائی دیتا ہے۔ اس نے تو میری طرف دیکھنے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہر چند کہ یہ بات صریحاً خلاف فطرت ہے بھلا ایک کمرے میں موجود دو آدمی، اتنی دیر تک ایک دوسرے پر نظر ڈالے بغیر کس طرح رہ سکتے ہیں۔ جتنی دیر تک وہ اور میں اس عدالتی کمرے میں اکیلے رہے ہیں۔ یقیناً آدمی اس حد تک لاتعلق ہے کہ اسے مجھ سے تو کیا انسانی فطرت اور اس کے تقاضوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔

وہ یقیناً ان لوگوں میں سے ہے جو ہر حال میں اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اس منطقی انداز کے باوجود جس کا مظاہرہ اس نے شروع سے اب تک کیا ہے اُسے پورا یقین ہو گا کہ وہ اپنے فرائض پوری دیانت داری اور مکمل احتیاط سے ادا کر رہا ہے۔ مسلسل اوپر سے نیچے کی طرف حرکت کرتے ہوئے اس کے کان، آگے اور پیچھے کی جانب پھیلتی اور سکڑتی جبڑوں کی ہڈیاں، ہونٹوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ، بار بار ہونٹوں کو تر کرتی ہوئی زبان، اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی تساہل یا غیر ذمے داری کا مرتکب ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس کی تمام تر کوشش کے باوجود، مجھ سے متعلق اس دستاویز کا ایک بھی لفظ مجھ تک نہیں پہنچ رہا۔ ہر چند کہ مجھے اس دستاویز کے ایک ایک لفظ اور اس کی ادائیگی کے تمام تر جزئیات سے واقف ہونا چاہئے ممکن ہے یہ دستاویز سماعت کے لئے عدالت کو دیئے گئے اختیارات سے متعلق ہو یا پھر اسے مجھ پر لگائے گئے الزامات سے مرتب کیا گیا ہو۔ دونوں

صورتوں میں عدالت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس دستاویز کی مجھ تک رسائی، یعنی اس کے پڑھے جانے کی آواز کو مجھ تک پہنچانا ممکن بنائے۔ ہر عدالت میں ملزم کو اپنے بارے میں تمام الزامات سے واقف ہونے کا پورا حق ہوتا ہے۔ ہر چند کہ ہمارے ہاں بنیادی حقوق کو معطل ہوئے ایک زمانہ ہو چکا ہے۔ لیکن ایک انسان کو چاہیے، وہ سرسری سماعت کی عدالت میں حاضر ایک ملزم ہی کیوں نہ ہو، اس بات پر کیسے آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صدیوں کی ردو کد سے ذرہ ذرہ وراثت ہونے والے اس حق سے محض اس لئے لاتعلق ہو جائے کہ اسے مسترد کرنے کے لئے ایک شخص نے فرمان جاری کر دیا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ رات کو آپ اطمینان سے سوئیں اور صبح کو آپ کے دروازے پر دستک ہو اور ایک شخص آپ کو بتائے کہ حکومت تبدیل ہو چکی۔ آپ اس پر ضرور حیران ہوں گے لیکن بہت زیادہ نہیں کیوں کہ بہت سے ملکوں میں مسلح افواج کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے ملک میں سب سے زیادہ منظم پارٹی ہیں، اس لئے اقتدار ان کے ہاتھوں میں رہنا چاہئے لیکن خیر ابھی آپ کی یہ حیرت ہی ختم ہوئی ہوگی کہ آپ کو بتایا جائے گا کہ آپ کی زندگی بھی تبدیل ہو چکی ہے اور یہ رہا آپ کا نیا نظام زندگی۔ لیجئے اور شروع ہو جائیے اور آپ نئے نظام کی عظمت کے ترانے گاتے ہوئے شروع ہو جائیں۔

اس پیش کاری کو دیکھیں، اصلاح اور تزکیہ نفس کی اس تدریج ساز تبدیلی کا حصہ ہونے کے باوجود اس نے تبدیلی کے اس عمل کو قبول نہیں کیا اور اب بھی وہ پوری کوشش کر رہا ہے کہ اس کی آواز مجھ تک پہنچ جائے شاید اسے علم نہیں کہ سرسری سماعت کی اس خصوصی عدالت میں اگر فرد جرم کے پڑھے جانے کی آواز مجھ تک نہیں پہنچے گی یا مجھے الزامات سے آگاہ کئے بغیر کوئی کارروائی کر دی جائے گی تو۔۔۔ تو بھی میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوگا کہ اس عدالت کے انصاف کو وہ جیسا بھی ہو، قبول کر لوں۔۔۔۔ ممکن ہے وہ

سوچ رہا ہوں کہ میں اس بات پر اعتراض کروں گا لیکن اگر فردِ جرم کا ملزم تک نہ پہنچنا اس نئے نظام میں انصاف فراہم کرنے کی حکمتِ عملی کا ایک حصہ ہے تو وسیع تر اختیارات رکھنے والی یہ عدالت میرے اعتراض کا نوٹس لینے کے باوجود کیا کر سکے گی؟ یوں بھی ایک ایسی عدالت سے انصاف کی توقع کرنا فضول ہی ہے جو منصف بھی ہے اور مدعی بھی، کیوں کہ آج دنیا میں رائج نظاموں میں سے ہے ایک کی تمام تر انصاف پرستی اور فراخدلی کے باوجود ایک مدعی خود کو مدعا علیہ کے مساوی نہیں سمجھ سکتا۔ گویا میری تقدیر اب اس کے سوا کچھ نہیں کہ بغاوت کے الزام سے بچنے کے لئے انصاف کے نام پر اس عدالت کے فیصلے من و عن قبول کرلوں۔ پر امن شہری ہونے اور قانون کے نفاذ کو قبول کرنے کا صرف ایک یہی راستہ باقی رہ گیا ہے لیکن اس وقت تو میں ایک عدالت میں ہوں اور ایک ملزم ہونے کی حیثیت سے مجھ پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ میں فردِ جرم کے بارے، ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ جان سکوں اور بنیادی حقوق کے معطل ہونے کے باوجود فردِ جرم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے پیش کار سے قریب ہونے، اتنا قریب ہونے کی کوشش کروں کہ اس کی آواز مجھ تک پہنچنے لگے لیکن اس سے پہلے کہ میرا جسم کٹہرے سے باہر آئے اور میرے پنجے دبیز قالین کی سطح کو چھونے لگیں، مجھے منصفوں سے فریاد کرنی چاہئے۔ انہیں اس بات سے آگاہ کرنا چاہئے کہ فردِ جرم کے پڑھے جانے کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی۔ بلاشبہ اس کے بغیر مجھ پر لگائے گئے الزامات میں ایک اور الزام کا ایک ناقابلِ تردید الزام کا اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن اس دوران جب میں فردِ جرم کو سننے کی کوشش کر رہا تھا میں نے اس بات کی قطعی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی کہ منصفوں کی طرف بھی توجہ دوں۔ میری اس غفلت نے ایک نئی مشکل پیدا کر دی ہے اب مجھے اپنی فریاد اس طرح کرنی ہوگی کہ سوئے ہوئے منصف بیدار بھی ہو جائیں اور انہیں میری فریاد ناگوار بھی نہ گزرے۔

"جنابِ عالی!۔۔۔۔آپ انصاف کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں، میں ایک ادنیٰ ملزم اپنی تمام عدم توجہ اور غفلت کے اعتراف کے ساتھ، آپ سے معمولی سی توجہ کی گزارش کرتا ہوں، آپ کی مسلسل نیند مجھے ایک نئی ناانصافی کا شکار بنا سکتی ہے۔ خدا کے لئے صرف ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھ لیجئے، آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا، میں آپ کے آرام میں خلل اندازی کے لئے معذرت خواہ ہوں، لیکن اب میرے پاس آپ سے فریاد کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کیوں کہ پیش کار کی تمام تر کوشش کے باوجود فرد جرم کا ایک لفظ مجھے سنائی نہیں دیا۔ اس صورت میں اگر آپ مجھے صفائی کا موقع دیں گے اور ظاہر ہے ضرور دیں گے تو میں اپنے بارے میں کیا صفائی پیش کر سکوں گا؟ جناب مجھے پورا علم ہے کہ یہ ایک غیر معمولی عدالت، سرسری سماعت کی ایک خصوصی عدالت لیکن بہر صورت یہ ایک عدالت ہے اور اس حوالے سے اس کے بھی کچھ نہ کچھ اصول ضرور ہوں گے۔ میں ان اصولوں کا پورا احترام کرتے ہوئے جن کے بارے میں اب تک مجھے کچھ علم نہیں، آپ سے صرف چند لمحوں کی زحمت کے لئے درخواست کرتا ہوں صرف ایک بار اس پیش کار کی طرف دیکھیں، آپ پوری بات از خود سمجھ جائیں گے۔ پوری بات کو سمجھانے کے لئے آپ میں سے کسی ایک کا صرف ایک بار آنکھ کھولنا، محض ایک جھپکنا بھی کافی ہو گا۔"

میں پوری قوت سے چیخنے لگا، جناب صرف ایک بار صرف ایک بار، لیکن میری آواز معزز منصفوں کو بیدار نہ کر سکی۔

منصف سو رہے تھے اور فرد جرم کے صفحات پلٹ رہے تھے اور میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں بہر صورت پیش کار تک رسائی کی کوشش کروں ایک ملزم جس تک فرد جرم کے پڑھے جانے کی آواز نہیں پہنچ رہی، جس کی فریاد سوئے ہوئے منصفوں کو بیدار کرنے میں ناکام ہو چکی ہو۔ اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے کہ خود کو کسی حد تک فرد